مارچ ۲۰۲۰ء

ذوق 5

سید نصرت بخاری
ارشد سیماب ملک

ذوق: (5)

مارچ 2020

●

مدیرِ اعلیٰ:
سید نصرت بخاری
(03225016121)
(03113002586)

مدیر:
ارشد سیماب ملک
(03315130899)

مجلس مشاورت:
اعجاز خان ساحر(فتح جنگ)
خالد خان (حضرو)
پروفیسر نثار احمد، (حضرو)

پتا:
سید نصرت بخاری، کامرہ کلاں، ضلع اٹک
ارشد سیماب ملک، النور پلازہ، بالمقابل گلی الائیڈ بنک، اٹک شہر
snusratbukhari@hotmail.com
malikarshadak@yahoo.com

قیمت: 300

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

فہرست

سید نصرت بخاری

اداریہ (1)
ذاتی کتب خانوں کی خدمات کا اعتراف کریں

ذاتی کتب خانوں کا دور ختم ہو گیا؛ جو چند ایک ہیں وہ بھی بے قدری کی نذر ہو جائیں گے۔ عام آدمی تو کتاب اور کتب خانے سے دور ہوا ہی ہے؛ ہماری حکومتوں کی ترجیحات میں بھی کتاب اور کتب خانے نہیں ہیں۔ ہمارے کتنے وزرائے اعظم، صدور، وزرائے اعلیٰ یا مقامی سرکاری انتظامیہ کے افسران نے ذاتی کتب خانوں کے دورے کیے ہیں؟ یہاں ایک ایک دن کی فضول تقریبات پر کروڑوں روپے صرف کر دیے جاتے ہیں؛ اونٹوں، گھوڑوں، کتوں کی دوڑ، لڑائی اور سیاسی تقریبات پر لاکھوں روپے اُڑا دیے جاتے ہیں؛ رقص و سرور کی محفلیں کروڑوں روپے ہڑپ کر جاتی ہیں لیکن ذاتی گھر میں، لاکھوں روپے اپنی جیب سے خرچ کر کے کتابیں خریدنے اور دن رات ان کی حفاظت کرنے والوں کی خدمات کا حکومتی سطح پر اعتراف کا کوئی اہتمام نہیں؛ انھیں کوئی ایوارڈ نہیں دیا جاتا؛ انھیں کوئی وظیفہ نہیں ملتا؛ اور تو اور زبانی طور پر بھی ان کی خدمات کو تسلیم نہیں کیا جاتا؛ گویا حکومت کی نظر میں یہ کارِ بے کار ہے۔ جب حکومت کا ان کتاب دوست لوگوں کے ساتھ یہ رویہ ہے تو نئی نسل میں سے کوئی یہ غلطی نہیں کرے گا؛ بلکہ بعض ذاتی کتب خانوں کے مالکان سے سنا ہے کہ ان کے بچے شکوہ کرتے ہیں کہ آپ نے ان کتابوں پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے، ہمارے لیے کیا کیا؟ جب حکومتیں آنکھیں بند کر لیں اور ان کی ترجیحات میں کہیں کتاب اور کتب خانوں کا ذکر نہ ہو تو بچے اسے کارِ بے کار سمجھ کر والدین سے ایسے سوال کرتے رہیں گے۔

حکومت میں بیٹھے ہوئے کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ دہشت گردی اور دیگر جرائم کی ایک بڑی وجہ کتاب سے دوری ہے۔ دہشت گردی کا قلع قمع کرتے کرتے اربوں ڈالر کا تاوان، اور ہزاروں جانوں کا نقصان برداشت کر لیا گیا لیکن کتب خانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے پاس روپے ہیں نہ وقت، حوصلہ افزائی کے لیے چند الفاظ بھی نہیں۔

یاد رکھیے کتب خانے کے اندر صرف کتاب نہیں ہوتی، علما کی صحبت بھی میسر آتی ہے جو سوچ

کے دھارے کو مثبت سمت عطا کرتی ہے۔ حکومتیں سوچ بدلنے کے نعرے تو ہر دور میں لگاتی رہی ہیں لیکن سوچ بدلنے کے ذرائع (کتاب، کتابیں) ان کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔

حکومت کو چاہیے کہ کتب خانے اور کتاب دار کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرے اور ذاتی کتب خانوں کے مالکان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان لوگوں کے لیے وظائف جاری کرے۔ حکومت کو یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جس کے پاس کم از کم پانچ ہزار کتابیں ہیں ؛ اور وہ کتابیں افادۂ عام کے لیے دستیاب ہیں تو ان کو حکومت کا ملازم تصور کیا جائے گا اور اُس وقت تک تنخواہ ملتی رہے گی جب تک کتب خانہ اور اس کا معیار قائم رہے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو دیکھ لیجیے گا، گلی محلے میں وڈیو گیمز کی دکانوں کی بجائے کتب خانے کھولے جائیں گے۔

ارشد سیماب ملک

اداریہ(2)

اکیسویں صدی کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی قرار دیا جاتا ہے۔دنیا بھر کی معلومات اور علوم وفنون تک رسائی اب صدیوں کا قصہ نہیں رہا۔جہاں دیگر شعبۂ زندگی میں جدت پیدا ہورہی ہے، وہیں اردو زبان بھی زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہورہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں کے برعکس اپنا دائرہ کار دنیا کے بیشتر ممالک تک بڑھا رہی ہے۔

اردو ویب سائیٹ ،اردو بلاگز ،اردو کے آن لائن کتب خانے ،اردو رسائل وجرائد کا انٹرنیٹ پر اجراء اور سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارم اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔لیکن تمام مساعی کے باوجود ادب کا دائرہ کار سکڑتا محسوس ہورہا ہے۔کتب بینی کی روایت تو پہلے ہی معدوم ہوچکی تھی ،سوشل میڈیا نے اب اس پر کاری ضرب لگادی۔دیکھا جائے تو ادب صرف ڈگریوں کے حصول اور اہلِ قلم تک ہی محدود رہ گیا ہے۔یہی نہیں ماضی کی کئی مقبول اصنافِ ادب بھی معدوم ہوتی جارہی ہیں، جن میں سے ایک اخبارات ورسائل میں خطوط نگاری بھی ہے۔

اردو رسائل جرائد نے ادب کی ترقی وترویج میں ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا۔اخبارات ورسائل میں خطوط نگاری کی روایت کم وبیش دو صدیوں پر محیط ہے۔اودھ لکھنو، دہلی اردو اخبار،تہذیب واخلاق ،اودھ پنچ ،اردوئے معلیٰ ،معارف اور نگار ایسے اخبارات ورسائل نے سیاسی ،معاشرتی ،علمی اور تحقیقی وتنقیدی مباحث کی جو بنا ڈالی اس نے آگے چل کر نہ صرف ہندوستان کی تقدیر بدلی بل کہ صحت مند ادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کے زمانہ میں صورتِ حال یکسر تبدیل ہوچکی لیکن یہاں اس بات کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے کہ صحت مند ادبی رجحانات کے لیے رسائل میں مکالماتی فضا کو تشکیل دینا ازحد ضروری ہے۔لہٰذا موبائل اور شوشل میڈیا پر رسمی ورسیدی پیغامات کی بجائے شاملِ اشاعت تخلیقات پر اپنے تجزیے وتبصرے ہمیں ارسال کیجیے تاکہ صحت مند ادبی رجحانات کے ساتھ رسائل میں خطوط نگاری کی معدوم ہوتی روایت کو بھی تقویت ملے۔

سید حبدار قائم ۔ اٹک

نظر مجھ کو نہیں آتے کہیں آثار یا اللہ
مدینے میں مرا جانا ہوا دشوار یا اللہ

بلا لیں مجھ کو بھی آقا ، یہی میری تمنا ہے
" میں ہوں مجبور اور معذور تو مختار یا اللہ"

ہوائیں رقص کرتی تھیں، فضائیں جھوم جاتی تھیں
وہؐ جب گھر سے نکلتے تھے مرے سرکار یا اللہ

نگاہِ مصطفےؐ کو تو نے ایسا فیض بخشا ہے
زمیں کے ذرے بن جاتے گل و گلزار یا اللہ

مدینے کی میں گلیوں کے ہر اک ذرے کو چوموں جو
مرے مدنی کے قدموں سے ہوا سرشار یا اللہ

درِ مرسل پہ جائے گا یہی قائم کی حسرت ہے
تبھی دم دم یہ کرتا ہے سدا اظہار یا اللہ

اعجاز خان ساحر: فتح جنگ

نعت

نعت سرکار کی کہتا ہوں اسی جان کے ساتھ
ذکر میرا بھی ہو مولا ترے حسان کے ساتھ

جانب خلد چلوں نعت کے دیوان کے ساتھ
اُن ﷺ کی نسبت بھی ہو شامل مرے میزان کے ساتھ

اپنی پہچان کو رب نے یہ وسیلے بخشے
یعنی قرآن بھی ہے صاحبِ قرآن کے ساتھ

یاں ملائک بھی اترتے ہیں سلامی کے لیے
کوئے طیبہ میں قدم رکھنا ذرا دھیان کے ساتھ

شہنشاہوں کے لیے وجۂ نجابت ٹھیرے
اس لیے ہاتھ ملائیں ترے دربان کے ساتھ

خاک طیبہ کی مقدر میں لکھی ہو شاید
لوٹ آتا ہوں مدینے اسی امکان کے ساتھ

لوگ کہتے ہیں مجھے اُن ﷺ کا ثنا خواں ساحر
حشر میں مجھ کو اُٹھانا اسی پہچان کے ساتھ

عارف قادری۔ٹیکسلا

نعت

کیا خوب ترے ذکر سے الحاق ہوا ہے　　پُرنور ہر اِک گوشۂ آفاق ہوا ہے

آنکھوں سے جو دل میں اتر آیا ہے وہ روضہ　　راحت کا امیں سینۂ عشاق ہوا ہے

اک ذات کہ ہر رنج میں ٹھیری ہے تسلی　　اک نام کہ ہر زہر کا تریاق ہوا ہے

ہر خوبیِ کردار ہوئی جس پہ مکمل　　حاصل وہ تجھے جوہرِ اخلاق ہوا ہے

کرنے کے لیے زیست ترا اسوۂ کامل　　تفویض ہمیں صورتِ اسباق ہوا ہے

خود صاف ہوئی نامۂ اعمال کی کالک　　جب صلِ علیٰ زینتِ اوراق ہوا ہے

امت کو کرے گا نہ سرِ حشر وہ رسوا　　مطلوب سے طالب کا یہ میثاق ہوا ہے

کس شانِ تلطف سے کس اندازِ کرم سے　　اللہ تری دید کا مشتاق ہوا ہے

تقسیم ہوئیں حشر میں اسنادِ شفاعت　　صد شکر کہ عارف پہ بھی اطلاق ہوا ہے

سلیم انصاری ۔انڈیا

ریگِ صحرا

یہ کاغذ پر جو تم نے خوبصورت گھر بنایا ہے
وہ میرے ذہن میں تعمیر ہوتے گھر سے کتنا مختلف ہے
کشادہ کمرے، آنگن، لان
ڈرائنگ ہال، ٹوائلٹ اور کچن ۔۔۔سب آئینہ ہیں
تمہارے ذوقِ آرائش، کمالِ فن
ہنرمندی، وژن اور خواب سازی کا
سبھی کمروں میں فرشِ مرمریں اور قیمتی سامانِ آرائش
تمہاری عیش کوشی کی علامت ہیں
یہ کاغذ پر جو تم نے خوبصورت گھر بنایا ہے
وہ ہر پہلو سے بہتر ہے
مگر اک گھر
جو میرے ذہن میں تعمیر کی منزل میں اب تک
میں اس چھوٹے سے بیحد خوبصورت گھر میں ۔۔خود کو
نئی نظموں کے تخلیقی عمل میں
بہت آسودگی محسوس کرتے دیکھتا ہوں
تمہیں کیا علم؟
تم تو اپنے ہی تجویز کردہ گھر میں
بے حس، بانجھ اور بوسیدہ جذبوں کی مدد سے
خوشی کے چند لمحوں کو پکڑ لینے کی
سعیء رائیگاں کرتے دکھائی دے رہے ہو
کہ سب آسائشیں اور سارا تعیش جمع کر کے
جھوٹے اسٹیٹس (status) کے مایا جال میں الجھے ہوئے ہو
درونِ ذات گویا۔۔۔۔۔ریگِ صحرا کی طرح بکھرے ہوئے ہو۔

نوید اقبال

کوئی رستہ

گفتگو ، گفتگو

ہے صدا در صدا
شام جنگل کے اندر کہیں ۔۔۔۔
جھینگروں کی اپیلوں میں موجود آہ و بکا
تبصروں سے گریباں اُدھڑے ہوئے
میں نہیں ، تو نہیں
اِس طرف ، اُس طرف
شور اتنا ٹریفک کا بڑھتا ہوا
چوک نعروں کی آواز کا طنطنہ
ماردو ، ماردو
سارے کندھے جنازوں سے بوجھل ہوئے
اور بارود تکبیر پڑھتا ہوا
شور بڑھتا ہوا
سرخ بتی بھی کب سے بدلتی نہیں
آنکھ بنجر زمیں
سانس چلتی نہیں
اس ٹریفک سے کوئی نکلتا نہیں
چاروں جانب کہیں کوئی رستہ نہیں

گلناز کوثر

Nightmare

بہت کالی راتوں کے گرداب سے
ایک آہٹ نکل کر
دبے پاؤں بڑھتی ہے
کھڑکی سے لگ کر
کوئی اجنبی شکل رونے لگی ہے
مجھے وہم ہے
میں اگر اس کے رونے پہ
رونے لگوں تو
یہ فوراً پگھل کر مرے ساتھ
بہنے لگے گی
کوئی لجاتی ہوئی چیز
سہمے حلق سے اترتی ہے
اور تھرتھراتی ہوئی سانس
جمنے لگی ہے
یہ پتھرائی دھڑکن کی
آواز ہے یا کوئی دھپ سے
بستر میں کُودا ہے
اور خرخراتی ہوئی ایک مدہم صدا
یہ صدا ہے یا پھر میری سوئی
نگاؤں کو دھڑکا لگا ہے

لرزتی ہوئی رات کی آنکھ
کھلتی نہیں ہے
کسی طور پتھرائی ساعت
پگھلتی نہیں ہے
مجھے وہم ہے پھر اگر یہ
پگھلنے لگی تو مرے ساتھ
بہنے لگے گی
اچٹتی ہوئی سسکیاں
لے رہا ہے کوئی
جیسے میں اپنے بستر میں
تنہا نہیں ہوں
ابھی میں نے چاہا تو ہے
چیخ کر اٹھ پڑوں
پر کسی نے
مری سانس باندھی ہوئی ہے
مرے پاؤں جکڑے ہوئے ہیں
کوئی اجنبی چیز ہے جو
مرے ایسے بے جان تن کو
دُھکنے لگی ہے
مری سانس رُکنے لگی ہے

ثاقب ندیم

خوابوں بھری نیند کی تلاش

مری آنکھ میں خواب جیسی کسی شے نے ڈیرے جمائے
خواب منظر سے خالی ہیں
اور آنکھ خوابوں کی بستی میں
در در بھٹکتی ہے
نیند کو ڈھونڈتی ہے
کلوننگ ہوئی ہے
کہ نینداب نیند پر
اور خواب پر خواب کا شائبہ ہے
خواہشیں، خواب اور نیند میں خواہشیں
خواہشیں حدِ امکاں سے باہر
یہ بے مائیگی تو نہیں ہے جو مٹی میں جاتے ہوئے
جسم کا ساتھ دے
یہ خواہش ہے
اور خواہشیں اب کلوننگ کا ہی پیش خیمہ ہیں
کلوننگ ہوئی ہے
مری آنکھ پلکیں جھپکتی نہیں ہے
یہ اُس نیند کو ڈھونڈتی ہے
جہاں خواب منظر سے خالی نہیں ہیں
جہاں نیند پر نیند اور خواب پر خواب
جیسی کسی شے کا دھوکہ نہیں ہے

شوکت کمال رانا۔ فتح جنگ

زنبیلِ نوا

میسر نیند کے ٹکڑوں سے
زنبیلِ سکوں بھرتے کئی راتیں
سرابوں کی نوردی میں سکوں کے بلبلے
چنتے گزاری ہیں
مگر خوابوں کی سوندھی باس
کو اڑتے نہیں دیکھا
جواں سالی میں خوشحالی کی فصلیں
نوچ کر موسم کی تبدیلی کے باعث
دوسرے ساحل کی جانب کوچ کرتے بے وطن
ویران ساحل کو پلٹتے ہیں
پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ریت سے جھیلوں
کو بھرتی ہے، رڑک سے خواب چکنا چور ہوتے
ہیں
مسلسل رات کی کالی لحد لاشوں سے بھرتی ہے
نکیرینِ وفا تصدیق میں ماضی کا کچا چٹھا
ایسے کھولتے ہیں برف کے تودے پگھلتے ہیں
تو برزخ جیسی راتوں میں پڑا آرام جلتا ہے
سحر کے صور کو ضعفِ سماعت پھر
کئی صدیوں ترستی ہے
گلِ زنبیل میں رخنے سے پڑتے ہیں
یہاں زنبیل بافی کے لیے صنعت لگی ہے

سب گداگر ہیں
حسیں محبوب، عاشق، والدیں بھائی، بہن
مجذوب، زاہد، ناتواں، شہ زور سب
اپنی طلب کی جھولیاں بھرنے میں راغب ہیں
یہاں تک کہ ادیبِ وقت، شاعر اپنے
خولوں میں مقید ہیں
ہوس نے ساری زنبیلوں کے پیندے
چھید ڈالے ہیں
گراں سے بے گراں شانوں کی توقیریں
زیاں کاری سے گھائل ہیں
مسافت کے دروں کچھ وسوسے اب بھی
حمائل ہیں
میسر نیند آ جائے تو میں
خوابوں کی زنبیلِ نوا کے چیتھڑے سی لوں
مجھے محروم جذبوں، خواب کی تعبیر سے
عاری زمانوں کی خرد میں ہوش بھرنا ہے

ثقلین انجم۔ اٹک

یہ کہانی گھڑی نہیں جاتی

دکھ تو خود ساختہ نہیں ہوتے
درد طاری نہیں کیے جاتے
یہ کہانی گھڑی نہیں جاتی
خواب پر مرضیاں نہیں چلتیں
حادثے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
یوں ہی آنسو نہیں گرا کرتے
روشنی ساتھ چھوڑ دیتی ہے
یہ اندھیرے یونہی نہیں ہوتے
بے بسی کے شکار لوگوں پر
ترس کھانا بڑی عبادت ہے
یہ جو دیوانگی کی وحشت ہے
یہ جو تنہائی کی مصیبت ہے
جس پہ اتری ہے وہ سمجھتا ہے
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
داستاں یہ بنی نہیں جاتی
یہ کہانی گھڑی نہیں جاتی

صدف اقبال۔انڈیا

تم

ایک آوارہ پرندے ہو
پرندہ اگر آوارہ نہ ہوتو
وہ پروں سمیت مرجاتا ہے
پروں سمیت مرنا
پرندے کی اذیت ناک موت ہے
تم
کبھی بھی ایک ڈالی پہ
اپنے پنجوں کے نشان
زیادہ دیر نہیں رہنے دیتے
تمہارے پر نئی اڑان کے لیے
پرتولتے رہتے ہیں
نئے دیس کی فضائیں
ہوائیں، پہاڑ، سمندر
درختوں کی ڈالیاں بلاتی رہتی ہیں
جاؤ
پہاڑوں پہ بسیرا کرو
نئی فضاؤں میں اڑان بھرو
نئی ندیوں میں نہاو
اور
نئی ڈالیوں پہ اپنی تھکان اتارو
اگر دل کرے تو لوٹ آنا

ورنہ
میرے جسم کا لوں لوں
تیرے قرب کے نشے میں ڈوبا ہوا ہے
ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
آوارہ پرندے سنو
لوٹنا
تو ندامت کا کوئی پر
اپنے جسم کے ساتھ
باندھ کر نہ لانا
احساس جرم کا کوئی چوگا
اپنی چونچ میں دبائے نہ آنا
ایسے آنا ایسے ملنا
جیسے پہلی اڑان میں ملے تھے

طاہر اسیر

کرونا وائرس

اے اوہ ہتھ نیں
جنہاں نُوں چا کے روز دعاواں کردیاں
تینُوں رب توں منگیا سی
تیرے جُوڑے لئی میں رنگ برنگے پھل کھوے سن
اے اوہ ہتھ نیں
جنہاں نے سوہنڑیں مکھ دا پیالہ پھڑیا سی
گھنڈ چُکیا سی
تے چیت وساکھ دی رُت وچ ڈنیاں پھڑ کے
ڈھول وجاے، بھنگڑے پائے
انہاں نوں اپڑیاں کناں اُتے رکھ کے
وچ مسیتی بانگاں دتیاں
میلیاں ٹھیلیاں دے وچ بہہ کے
ماہیے ڈھولے ٹپے گائے
ایہو ہتھ نیں
جنہاں دی ٹیک بنا کے ماں نُوں قبریں لاہیا سی
علم عباس دا چایا سی
سچیا ربا
اج میں ہتھاں ویکھ کے سوچ رئیا واں
کس نُوں ہتھ ملاواں، کس نُوں قبریں لاہواں
کدھرے مر نہ جاواں

سید نصرت بخاری

گونڑ

(کیمبل پوری لہجہ)

کدے کدے دِل کرے گونڑ گانڑَیں تے
یاداں والے بُوٹیاں وَاں پانڑِیں پانڑَیں تے

ہر گانڑَیں پچھے ہِک لمی کہانڑیں ایں
کہانڑیاں نی اَکھاں وِچ نِرا پانڑِیں ایں

آپڑیاں پَھڈاں اُتے لُونڑ لانڑیں تے
کدے کدے دِل کرے گونڑ گانڑَیں تے

یاداں تے کہانڑیاں نی جھول بھری اَے
وَدُھو وَدھ ہِکی کولوں دُوئی کھری اَے

یاداں تے کہانڑیاں توں زنگ لاھنڑیں تے
کدے کدے دِل کرے گونڑ گانڑَیں تے

وَیلے پِچھے نسڑِیں نا مزا آپڑاں
نِکل کے پَھسڑیں نا مزا آپڑاں

رَتے رَتے پَلگاں تے دل ڈاھڑیں تے
کدے کدے دِل کرے گونڑ گانڑَیں تے

ڈاکٹر عابد سیال۔اسلام آباد

غزل

نخلِ فرصت کے تلے اوٹ بنائی ہوئی ہے
شام کی قاش ہے اور وقت سے کاٹی ہوئی ہے

رات کے پردے بھگونے لگی لہجوں کی نمی
بات مت روک طبیعت ذرا ہلکی ہوئی ہے

آگے اقرار کی منزل پہ کہیں ملتے ہیں
چل کہ یہ راہِ تذبذب مِری دیکھی ہوئی

اشک سا پھول گرا جاگتے سینے پہ مِرے
ایک سلگن ہے جو مہکار میں لپٹی ہوئی ہے

ایک سرشاری، ملے وقت کی سرحد سے پرَے
اک کسک سی کہ ملاقات ادھوری ہوئی ہے

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع۔ساہیوال

غزل

میانِ رہزن و رہبر مجھے نہیں معلوم
یہ کون ہے مرے اندر مجھے نہیں معلوم

ستارہ وار چلا تھا دیارِ خواب کی سمت
یہ آ گیا ہوں کہاں پر مجھے نہیں معلوم

گزر رہا ہوں کسی قریۂ جمیل سے میں
بہشت ہے کہ ترا گھر مجھے نہیں معلوم

میں تجھ سے دور کسی شہرِ نارسا میں ہوں
میں کس لیے ہوں یہاں پر مجھے نہیں معلوم

ذرا سی دیر کو مدھم ہوئی چراغ کی لو
پھر اس کے بعد کا منظر مجھے نہیں معلوم

بس اک اڑان کی خواہش نے آلیا تھا مجھے
کہاں گئے مرے شہپر مجھے نہیں معلوم

لیے تو پھرتا ہوں اک وسعتِ نظر کو میں
یہ عشق ہے کہ سمندر مجھے نہیں معلوم

نوازاعظمی

غزل

مدحتِ سیدِ سادات میں کھو جاتا ہوں
کتنے پاکیزہ خیالات میں کھو جاتا ہوں

ابھی میں سوچتا رہتا ہوں کہ کیا مانگنا ہے
اس سے قبل اُن کی عنایات میں کھو جاتا ہوں

پھر مجھے ڈھونڈنا پڑ جاتا ہے خود اپنا وجود
جب مدینے کے مضافات میں کھو جاتا ہوں

کبھی میں سوچتا ہوں ان کی صلہ رحمی کو
اور کبھی طرزِ مواخات میں کھو جاتا ہوں

خود بخود نعت کے پیرائے میں ڈھلتے حروف
جب بھی قرآن کی آیات میں کھو جاتا ہوں

جو سناتا ہے مجھے شہر نبیؐ کے احوال
اس کے ہر لفظ ہر اک بات میں کھو جاتا ہوں

نعت لکھنے کا ارادہ جو میں کرتا ہوں نواز
ان کے اوصاف وکمالات میں کھو جاتا ہوں

راشدہ ماہین۔ اسلام آباد

غزل

قبلۂ مُحترم آپ کے شہر میں
لُٹ گئے آج ہم آپ کے شہر میں

آپ کھونے لگیں آپ کو ڈھونڈ کر
کھونے لگ جائیں ہم آپ کے شہر میں

روشنی جسم و جاں میں نکھرتی رہی
روشنی کی قسم آپ کے شہر میں

رات بھر آسماں سے اُترتے رہے
چاند تارے صنم آپ کے شہر میں

تتلیاں راستوں میں بناتی رہیں
خوشبوؤں کے قدم آپ کے شہر میں

داستاں اپنے دل کی سُنا کر چلے
سارے اہلِ قلم آپ کے شہر میں

آپکے شہر کی خوشبوؤں میں بسے
میری زلفوں کے خم آپ کے شہر میں

میری آنکھوں کے خوابوں میں کھوئی رہی
اِک نگاہِ کرم آپ کے شہر میں

میرے بستر پہ جگنو اُترنے لگے
جب ہوئی رات نم آپ کے شہر میں

آپ کے ساتھ ماہین بھی آپ کی
ہوگئی جامِ جم آپ کے شہر میں

فرزانہ خان نیناںؔ

غزل

کوئی دستک بھی ہو تو در خاموش
ایک مدت سے میرا گھر خاموش

دھول پیروں کی اڑنے دینی نہیں
اب تو کرنا ہے اک سفر خاموش

بجھ گیا آج بھی چراغ مرا
ہو گئی آج بھی سحر خاموش

کم سخن چیختے ہی جاتے ہیں
اور بیٹھا ہے باہنر خاموش

جانے والے کا سب پتا ہے مجھے
مت سنا مجھ کو یہ خبر، خاموش

کوزہ گر ہو گیا کہیں مصروف
میرے نیناں ہیں چاک پر خاموش

بشارت وقار۔ جھنگ

غزل

تیری تصویر کا تابوت اٹھائے دل میں
حسرتیں حلقہ بنا کر کریں ہائے دل میں

جتنے ارمان کیے قتل کہو قاتل سے
تعزیت کے لیے آنا ہو تو آئے دل میں

جو بڑے شوق سے لوگوں کو سنائے تو نے
ہم نے وہ راز ابھی تک ہیں چھپائے دل میں

جانے کیا چھوڑ گیا تھا ابھی جاتے جاتے
ایک نشتر ہے کہ چبھتا چلا جائے دل میں

تیرے آنچل میں ستارے بھی نہیں ہیں اتنے
جتنے پیوند پہ پیوند قبائے دل میں

اس عجائب میں ہیں آثار قدیمہ باقی
جس کو آنا ہے بھلے شوق سے آئے دل میں

ہم نے اس دل کے الاؤ کو جلایا پھر سے
اب نئے شوق سے پردے بھی لگائے دل میں

اے مری چشم! یہ نایاب ہیں گوہر نہ گریں
تو ہے مجبور تو پھر اشک گرائے دل میں

جن کی تسطیر پہ تعزیر لگائی جاتی
سب وہ اشعار بشارت نے سنائے دل میں

محمد ظہیر قندیل۔حسن ابدال

غزل

جب ڈوبتے وہ دیکھتا ہے آب میں مجھے
تنہا کنول بلاتا ہے تالاب میں مجھے

دیکھا تھا ایک خواب کبھی جاگتے ہوئے
تعبیر تو ملی ہے مگر خواب میں مجھے

کردار اک نیا ہوا داخل کتاب میں
مرنا پڑے گا اب تو نئے باب میں مجھے

پیچھا چھڑا سکوں تو چھڑا لوں انا سے میں
جس نے جمایا ذات کے برفاب میں مجھے

اب دیکھنے لگا ہوں میں آسودگی کے خواب
اب مت، لپیٹ گردش اسباب میں مجھے

مایوسیوں نے بخشی ہے کچھ یوں قنوطیت
آتا نظر سراب ہے سیراب میں مجھے

کب کا شراب خانے سے آگے نکل گیا
جا کر تلاش کر کسی محراب میں مجھے

وحشت میں آ کے اپنی زباں بھولنے لگا
جب اس نے مضطرب تکا سیماب میں مجھے

آؤ گلے لگاؤ مجھے سب مصیبتو!
ملتا بہت سکون ہے گرداب میں مجھے

قندیلؔ ہے فریفتگی کا اثر سبھی
اردو نے لکھ دیا ادب آداب میں مجھے

بریگیڈیئر فرخ ہمایوں

غزل

کربِ فُرقت کا نہ مِل پایا کہیں چارہ کوئی
لوٹ آیا ہے تیری بزم میں دوبارہ کوئی

ڈھل چلی شام تو پھر کاکُلِ غم لہرائی
آنکھ سے ٹوٹ کر بکھرا ہے سِتارہ کوئی

یہ تپش ایسی ہے کہ آتا ہے کلیجہ مُنہ کو
دِل پہ رکھا ہے دہکتا ہوا انگارہ کوئی

میں بُجھا تا ہوں مُحبت کے الاؤ ہر دِن
روز اِک آگ لگا جاتا ہے مہ پارہ کوئی

تابشِ عِشق سے زیبا ہے جہانِ فرُخ
خامہ فرسائی کو کافی ہے اشارہ کوئی

سلیمان جاذب: دبئی

غزل

ہم جو منظر پہ آنے لگتے ہیں
دوست ہی دل دکھانے لگتے ہیں

آپ سے کچھ نہیں چھپاتا میں
آپ کیوں آزمانے لگتے ہیں

پہلے لگتے ہیں وہ گلے میرے
پھر وہ آنسو بہانے لگتے ہیں

یا وہ شعروں میں بات کرتے ہیں
یا کبھی مسکرانے لگتے ہیں

درد، آنکھوں سے پھوٹ بہتا ہے
زخم تک مسکرانے لگتے ہیں

دو گھڑی بھی ملیں تو جاذب جی
آپ بیتی سنانے لگتے ہیں

صبا ممتاز بانو

شرط

وہ ایک سرد شام تھی۔ ہم دونوں ایک کمرے میں بند تھے اور لطف اندوزی کے آسمان پر رقصاں تھے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ میں اس لیے اس کے پاس آتی جاتی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ ضرورت پوری کرنے کے لیے کسی رشتے کا ہونا ضروری نہیں ہوتا اس کے لیے تو بس ایک وجود ہونا ضروری ہوتا ہے جو نہ صرف طاقت ور ہو بلکہ عورت کو پیار کرنے اور اس کا جسم و جاں جیت لینے کا سلیقہ بھی جانتا ہو۔ وہ جو تن مردہ میں بھی زندگی دوڑا دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ ایسا ہی تو تھا۔ میرا اس سے قربت کا رشتہ ایک ایسی شام میں استوار ہوا تھا جب میں اپنے کسی کام کے لیے اس کے آفس میں گئی تھی۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر جھکا ہوا کوئی کام کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کام کے دوران باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھتا بھی رہا کہ '' اس کا بنایا ہوا ڈیزائن مجھے پسند بھی آ رہا ہے کہ نہیں۔'' میں ہوں ہاں پر سر ہلاتی رہی۔ رات کے کھانے کا وقت ہوا تو اس نے کھانا منگوا لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں جو بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو پڑھتے پڑھتے اس کے ذہن کو پڑھنے لگی۔ عین اسی لمحے بجلی نے دغا دے دیا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مانند دیوار میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ''مت جاؤ۔ آج ادھر ہی رہ جاؤ نا۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔ اس کا گرم ہاتھ میرے سرد ہاتھ میں تھا یہی وہ لمحہ تھا جب میں قطرہ قطرہ پگھل گئی۔

میں نے چپ سادھ لی اور پھر سے دستر خوان پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نوالہ توڑا اور اپنا سارا پیار اس میں لپیٹ کر میرے منہ میں ڈال دیا۔ ہم نے بے خود کیفیت میں کھانا کھایا۔ ضمیر نے نگاہیں جھکا لیں اور خمیر کو راستہ دے دیا۔ ایک عرصے سے بھوکی پیاسی بلبل وادی محبت میں اتر گئی۔

اس نے دستر خوان سمیٹنے کے بعد اپنا بستر زمین پر بچھایا، لائیٹ آف کی اور اپنے بازو پھیلا دیے۔ پھر جیسے برسوں سے مقید تشنگی کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ اضطراب مسکراتا گیا اور سکون اپنا راستہ پاتا گیا۔ اس رات میں نے محبت کی وہ چاشنی چکھی جو اب تک میں اپنے مرحوم خاوند سے بھی محسوس نہ کر سکی تھی۔

'' اف، اسی کی تو ہوتی ہے ضرورت۔ یہی تو ہے راحت۔ اسے کہتے ہیں محبت، اسی کی تھی طلب۔

'' میرے بدن نے ایسی سرشاری کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

ساری رات دو بدن ملتے ملاتے اور ہنستے ہنساتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر جسموں کی تھکن نے نیند کا بدن اوڑھنا چاہا۔
میٹھے سے رت جگے کے بعد اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں اور مجھے بھی آرام کی ضرورت تھی۔ صبح دم جا کر ہم دونوں گھڑی بھر کو سوئے تھے کہ بوریا بستر لپیٹنے کا وقت ہو گیا۔ کوئی بھی آ سکتا تھا۔ یہ ایک پلازہ کا دفتر تھا۔ کوئی گھر تھوڑی تھا۔ میرے پیرہن نے ابھی میرے بدن کو ڈھانپا ہی تھا کہ اس نے پھر سے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور میں ایک بار پھر شراب وصل میں مدہوش ہوتی چلی گئی۔ جانے، اسے مجھ سے محبت زیادہ تھی یا مجھے اس کی ضرورت زیادہ تھی لیکن ایک بات تو طے تھی کہ ہم انتہائے طلب کے مسافر تھے۔ جاتے سمے اس نے میری آنکھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔
''یہ میری زندگی کی ایک یادگار اور حسین رات تھی۔ تم لطف کی جاگیر ہی نہیں، طاقت کی بھی دھنی ہو۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہیں بہت آگے لے جاؤں گا۔ مجھے شاعری آتی ہے۔ میں مصور بھی ہوں۔''
میں مسکرا دی۔ ''مگر قلم تو میرے ہاتھوں میں بھی حالتِ وجد میں آ جاتا ہے۔''
وہ میری بات سن کر تھوڑا سا آگے جھکا، '' اس حسین بدن کو کسی کی ضرورت ہے پھر جو ہم تم تخلیق کریں گے۔ دنیا اس پر رشک کرے گی۔ ملکہ بننے کے لیے ایک بادشاہ چاہیے۔''
اس کی باتوں پر غور کرنے لیے مجھے وقت چاہیے تھا۔ میں ابھی اس رات کے نشے سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میرا تناؤ کسی ریاست کی شہزادی جیسا تھا اور اس کا جھکاؤ غلام جیسا، اس نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میں کوئی عام عورت نہیں ہوں، میں تو خاص الخاص ہوں۔
وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ '' تم اگر بادشاہوں کے دور میں ہوتی تو ضرور ملکہ یا شہزادی ہوتی۔''
مجھے اس کی بات پر رتی بھر بھی شک نہیں تھا اس لیے کہ میں تو خود اپنے ہی حسن پر فریفتہ تھی۔ میرا تو آئینہ بھی بولتا تھا کہ مادام! آپ ملکاؤں اور شہزادیوں سے زیادہ حسین ہیں۔ آپ شہزادی ہوتیں تو آپ کے اردگرد بھی غلاموں اور کنیزوں کا ایک ہجوم رہتا۔ اب، اس دور میں تو شہزادیوں کے پاؤں کی دھول راج کر رہی ہے، جن کے قد چھوٹے، ناک ٹیڑھے اور شکلیں عام ہیں۔ جن کے بھدے وجود حسن سے عاری ہیں اور جن میں شب بھر چمکنے کی صلاحیت ہے نہ دن بھر دمکنے کی۔ آپ ایک وسیع اور طاقت ور کائنات کی ملکہ جس کے ہوتے ہوئے بادشاہ کو کسی اور بیوی کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی۔ مثل آفتاب چندے ماہتاب، آپ کا حسن تو چاند سورج کو شرماتا ہے۔''
مگر ہائے میں تو تب پیدا ہوئی جب وہ دور گزر چکا تھا۔ لیکن اب یا تب میرا بس ہی کیا تھا؟۔ تقدیر کے پھندے بھلا اپنی مرضی سے بھی کسی سے جڑے ہیں۔ مجھے اس دور ہنگامہ خیزی میں جنم لینا تھا، سو لیا۔
اس رات کی ملاقات نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا اسیر کر لیا۔ وقت کی گزران میں ہم دونوں

ایک دوسرے کی تسکین کرتے رہے۔ اس نے مجھ سے بہت کہا کہ میں اس سے شادی کرلوں لیکن مجھے اس کی نہیں۔ اس سے بہتر کی تلاش تھی۔ میں کسی خوش شکل کو دیکھنا چاہتی تھی۔ میں کسی امیر کو لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ ان دونوں اوصاف سے تہی تھا۔ ہاں وہ کسی بھی عورت کو لذتِ حقیقی سے نواز سکتا تھا۔ اپنے اس ہنر سے آگاہی تو اسے بھی تھی۔ اسے اپنی جسمانی طاقت پر زعم تھا۔

''سنو۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک امیر خاوند کو پالو۔ جو دولت سے تمہارا دامن بھر دے مگر وہ دنیائے تسکین میں ناکام ہوا تو کیا کرو گی۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیتی، ''میں اس کا علاج کراؤں گی۔ اسے تم جیسا بنالوں گی۔''

وہ کئی سال مجھے یہ سمجھانے کی کوشش میں لگا رہا کہ مجھے اس جیسا شیر جوان نہیں ملے گا اور میں اسے یہ باور کرانے میں لگی رہی کہ مجھے اس سے بہتر کی تلاش ہے۔ وہ کب تک میرا انتظار کرتا۔ اس نے تنگ آ کر اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی۔

میں جو اس زعم میں مبتلا تھی کہ وہ میرے شادی کرنے سے پہلے کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی شادی کی خبر سے کچھ بکھر سی گئی۔

''محبت۔ اسے کہتے ہیں محبت۔ میری شادی کا انتظار بھی نہیں کیا اور ڈھول بجا دیئے۔''

اس کی شادی کے بعد ایک اچھے خاوند کی تلاش میرا مقصدِ عظیم بن گئی۔ بالآخر اس کی شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے بھی ایک ساتھی مل ہی گیا۔

ایک پڑھا لکھا شخص جو اس کی نسبت شکل وصورت میں بھی بہتر تھا اور پیسے کے اعتبار سے بھی۔ میں نے شادی سے قبل قسم کھائی تھی کہ خاوند کے ہوتے ہوئے گناہ نہیں کروں گی۔ ایک گناہ اسی کے ساتھ تب کیا تھا جب بلبل بہت بے چین تھی۔ اب وہ کسی اور کا تھا اور میں بھی تو اب کسی اور کی تھی۔ اب ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ محبت تو مجھے اس سے پہلے ہی نہیں تھی۔ ضرورت بھی قبر میں دفن ہوگئی تھی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ اسے جس محبت کا دعوی تھا۔ وہ بھی تھی یا بس ایک فریب تھا اور یہ فریب اس نے مجھے دیا تھا یا اس کے دل نے اسے دیا تھا لیکن ابھی ہم دونوں کو اس سوال کا جواب کیسے مل سکتا تھا؟ ابھی تو مرادوں کے دن رات تھے۔ ابھی تو ساعتوں میں شادیانے بج رہے تھے۔

پھر شادمانی کا یہ عرصہ بھی گزر ہی گیا۔ اب حقیقت آنکھیں کھولے کھڑی تھی۔ ہاں سچائی یہ تھی کہ اس نے تو اپنی بیوی کے بدن سے تسکین پائی تھی یا نہیں مگر میرے حصے میں ایک ایسا مرد آیا تھا جس کی مردانگی میں کوئی خاص دم خم نہ تھا۔

''ہائے۔ تسکین کا چاند کبھی پورا کیوں نہیں ہوتا۔ دلہن ارمانوں کی ڈولی میں بیٹھ تو جاتی ہے مگر ارمان

پورے نہیں ہوتے۔ یہ طلب ہمیشہ چوبارے پر کیوں چڑھے رہتی ہے۔کون اس کو نیچے اتارے، مگراس سے تو اب شناسائی تک نہیں۔''
وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا یا نہیں۔ میں پرسکون تھی یا نہیں مگر ہم دونوں کا ایک دوسرے کی مانگ کرنا محال تھا۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی، مجھے اس سے نفرت ہو چکی تھی۔اس کی وجہ بھی ان دنوں پیدا ہوئی تھی جب وہ کسی کا دولہا بننے کی خوشی میں اس قدر حواس کھو بیٹھا تھا کہ اس نے مجھے چھوٹی سی بات پر بے نقط سنائی تھیں۔اس دم مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ میں تو بس صابن کی ایک ٹکیا تھی۔اس نے مجھے استعمال کیا اور ختم۔ایک نئی عورت کے آتے ہی اس کے لہجے میں میرا احترام رہا اور نہ وہ التجا جو کہ وہ ہر بار مجھ سے ملنے کے لیے کرتا تھا۔
میں نے اس کے بیزار لہجے میں بھیگی ساری باتیں اپنے سینے میں محفوظ کر لی تھیں۔ مجھے دکھ تو ہوا تھا لیکن اپنے دعوے کی سچائی پر خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ واقعی ضرورت کے کندھوں پر سواری کر رہا تھا۔ شادی کے بندھن نے ہم دونوں کو اپنے اپنے ساتھی کے ساتھ وفاداری کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ کام کے لیے کبھی کبھار ایک دوسرے سے واسطہ ضرور ہوتا مگر بات ہیلو ہائے تک رہی۔کبھی کبھار ادائے دلبرانہ اس کے لہجے میں جھلکتی، میں موضوعِ سخن کسی اور طرف کر دیتی۔وہ بات بڑھانے کی کوشش کرتا تو میں بات ختم کر دیتی۔وہ دامن پکڑنے کی کوشش کرتا تو میں دامن سمیٹ لیتی۔ میں اسے ہاتھ آتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔'' پسپائی مرد کی عادت کب ہے؟۔وہ بھی اس عورت کے لیے جو کبھی اس کے بستر پر رہ چکی ہو۔''
انہی دنوں میں اس کا اور میرا آمنا سامنا ایک نمائش میں ہوا، جہاں وہ بھی موجود تھا اور میں بھی۔ہم ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے لیکن نہ اسے پتا تھا اور نہ مجھے۔دن کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد میں اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے گزرے وقت کا حساب لگا رہی تھی کہ وہ آ گیا۔جانے اس نے کس وقت مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے دروازے سے ہی کھسکانا چاہا۔اس نے میرے بازوؤں کو جھٹکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔
''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔پلیز مجھے اندر آنے دو۔'' وہ شدتِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے راستہ دیتے ہوئے اپنا نائیٹ گاؤن ٹھیک کیا۔
وہ میرے بیڈ کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔اس کی نگاہیں میرے چہرے کا طواف کرتی ہوئی میرے بدن کے پیچ و خم پر غور کرنے لگیں۔وہ گزرے وقت کے اثرات کا اندازہ لگا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔
''یہ میرا نشہ ہے کہ مجھے دیکھ کر اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے یا پھر کسی بھولی بسری عادت نے اسے جھکنے پر

مجبور کر دیا ہے۔''
اس نے میرے پاؤں کو پکڑ لیا۔ میں نے اس کی بے قرار آنکھوں میں جھانکا۔''تمہارے بعد میں وہ زمیں کبھی نہ پا سکا جس پر قدم رکھتے ہی میں آسماں کو چھونے لگتا تھا اور لطف و اکرام کی بارشیں میرے وجود کو نہال کر دیتی تھیں۔ مجھے ایک دفعہ اسی بارش میں بھیگنے دو۔''
اس کے لہجے میں تڑپ تھی۔ میں نے اس کے اضطراب کو پوری طرح محسوس کیا اور اپنے بھی۔ لذت وصل میں نشہ ہو تو برسوں بیت جانے کے بعد بھی یہ سر چڑھ کر بولتی ہے۔
'' ہاں: وہ اکیلا تھوڑی تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔''
اپنے اس احساس نے جونہی مجھے چھوا، مجھے اپنے آپ پر شدید غصہ آیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ کو پرے کیا۔
'' ہٹو۔ میں اب کسی کی ملکیت ہوں، کیا تم چاہو گے کہ تمہاری بیوی کسی کے ساتھ سوئے۔''
'' میں کسی نہیں، میں تو وہ ہوں جس نے تمہاری تصویرِ بدن کو اپنے خونِ جگر سے تراشا ہے۔ تمہاری اندر کی مامتا کو سرشار کیا ہے۔ پاکیزہ لعاب دہن کی بارش سے تمہاری زمیں کی تشنگی کو ختم کیا ہے۔ تمہارے قدموں میں سر رکھا ہے۔ تمہارے تلوؤں کو بوسے دیئے ہیں۔ ہر کونا بدن سے جھنکار کو اچھالا ہے۔ تمہارے لیے ہر لطف کا سامان کیا ہے۔''
اس کی انگلی میرے چہرے کو چھوتی ہوئی لمحہ بہ لمحہ میرے سینے، کمر، پیٹ، زیر ناف، ٹانگوں اور پھر میرے پاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے ایک دم اسے یاد آ گیا۔
''سنو۔ میں نے تمہاری دھرتی کی آغوش سے نکلے ہوئے ستاروں کو بھی چوما تھا''۔ اب میرا صبر جواب دے چکا تھا۔ میں بے ساختہ بول پڑی۔
'' ہاں ہاں۔ تم نے یہ سب کیا تھا لیکن تم نے مجھے کمخواب نہیں پہنایا۔ تم نے زرقون سے ہمیشہ مجھے دور رکھا۔ تم مجھے پوری روٹی نہیں دے سکتے تھے تو نہ سہی مگر تم نے مجھے اپنی آدھی روٹی میں بھی حصے دار نہیں بنایا۔''
''جان من، اب کروں گا نا، جو تم چاہو گی۔ پھر تم مان جاؤ گی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' اس کی چاہت اپنی لپیٹ میں مجھے لینے کے لیے بے تاب تھی۔
میں نے اس کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ غالباً وہ اب مالی طور پر مستحکم ہو چکا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ دے سکتا تھا جس کی مجھے تمنا تھی۔
'' اب مجھے دھن دولت نہیں، کچھ اور چاہیے۔'' میں نے دل کی بات اسے بتائی۔ وہ میری بات سن کر تھوڑا سا اور قریب آیا۔

’’جو تم کہو گی۔ میں کروں گا۔ میری دنیا میں آ جاؤ۔‘‘ وہ سسک رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے۔ میں گویا تھی اور وہ خاموش۔ میں حاکم تھی اور وہ محکوم۔ میں شہزادی تھی اور وہ غلام۔ میں نے زہرخند ہونٹوں پر سجائے اس کی طرف دیکھا اور اسے وہ سب کہہ دیا جو میں چاہتی تھی۔ وہ حیران و ششدر سا مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی کیفیت سے محظوظ ہونے لگی۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر شرمندہ سا الٹے قدموں واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

پھر کئی ماہ گزر گئے۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مجھے لگا بپھرا ہوا سمندر اب خاموش ہو گیا ہے۔ میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ زندگی اپنی اپنی راہ پر چلنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ کسی راہ پر بھی نہیں ملے گا۔ میری شرط کڑی تھی۔ اس کا حوصلہ تھوڑا۔

اس دن بہت سردی تھی۔ رات کا بڑھتا ہوا اندھیرا سردی بھی بڑھا رہا تھا۔ میں کمبل میں اپنے خاوند کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی پھر بھی تھرتھر کانپ رہی تھی۔ میرے موبائل پر اس کے میسج نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے خاوند کو دیکھا۔’’ آج اتنے ماہ بعد اور اس وقت، شاید کوئی کام ہو۔ شاید وہ کسی پریشانی میں ہو مگر گھر آنے کی کیا تک تھی۔‘‘

میں نے جھنجھلاتے ہوئے جلدی سے چپل پہنی اور دبے دبے قدموں سے دروازہ کی طرف بڑھی۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

’’تم۔ اس وقت۔‘‘ میں نے پوچھا تو اس نے اپنے قریب کھڑی اپنی خوب صورت بیوی کا بازو پکڑا اور دھیرے سے اندر کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔’’میں اسے لے آیا ہوں ۔‘‘

میں نے اس کی حسین و جمیل مگر فربہی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔

’’اسے لے جاؤ۔ میرے خاوند کو موٹی عورتیں بالکل پسند نہیں۔‘‘

اپنی قربانی کو رائیگاں جاتے دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس کے پسپا حوصلے کو دیکھ کر طمانیت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اس نے اپنی بیوی کا بازو پکڑا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ ٹھیک اسی لمحے میرے اندر سے ایک نادیدہ سایہ چیختے چلاتے ہوئے نکلا اور میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

معظم شاہ

لاعلاج

طاہرہ نے اس کے لیے کچھ تصویروں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بوڑھی اس کی این جی او نے لکھنؤ کی سڑکوں سے پکڑی تھی، میلے کچیلے کپڑوں میں اپنے آپ سے بے خبر گھومتی رہتی، کسی نے کچھ دے دیا تو کھالیا، جہاں پناہ دیکھی پڑ رہی، وہ بہت کم بولتی تھی، بولتی تو لگتا کہانی سنا رہی ہو، اس کے بے ربط الفاظ بھی کسی ایک منظر کی ہلکی سی جھلک دکھا کر الجھ جاتے تھے، جیسے ٹی وی پر اچھا بھلا منظر کالے اور سفید رقص کرتے نقطوں میں بدل جائے۔ اس کے لہجے سے طاہرہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کشمیری ہے۔

طاہرہ کو بطور سائکالوجسٹ اس این جی او کے ساتھ کام کرتے پندرہ برس ہو چکے تھے، اس عرصے میں اس نے بہت سے لوگوں کی نفسیاتی مدد کی تھی لیکن یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین کیس تھا۔ بوڑھی سے نام پوچھو تو "امی" کہتی تھی ۔۔۔۔۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ اپنی ماں کی بات کرتی ہے، لیکن جلد ہی اس نے جب پیار سے کہا امی ۔۔۔۔۔ اور بوڑھی نے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اسے لگا وہ کسی حد تک اس کے درد سے اٹے وجود میں داخل ہو چکی ہے، تبھی اس نے کچھ تصاویر منتخب کی تھیں بوڑھی کو دکھانے کے لیے۔

کئی سیشنز گزر جانے کے بعد بوڑھی اب کھل کر بولنے لگی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی، اس کے اپنے بارے میں پوچھو تو چپ سادھ لیتی اور پھر کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھی ۔۔۔ دوسرے تیسرے دن بمشکل وہ اس کی زبان کھلوا پاتی اس لیے اب اس نے بوڑھی کی ذات کے بارے میں سوالات کو گویا نصاب سے باہر کر دیا تھا، بس وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیتی اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتی اور اس کے جھریوں والے ہاتھ سہلاتی رہتی پھر کوئی نہ کوئی تصویروں کا سیٹ دکھاتی اور بوڑھی بولنے لگتی۔ وہ ان کہانیوں کو ریکارڈ کر رہی تھی، گھر جا کر انہیں سن کر نوٹس تیار کرتی اور بڑھیا کی فائل میں لگا دیتی۔

آج اس نے کشمیر کے ایک سکول کی تصاویر منتخب کی تھیں اور بوڑھی دیکھ کر بے اختیار بولنے لگی تھی۔ دوسرے دن اس نے بچوں کی کچھ تصاویر نکالیں اور بوڑھی نے ایک اور سمت میں الفاظ کے قدم اٹھا دیے لیکن اسے لگا کہ آج کی کہانی کل کی کہانی سے ربط رکھتی ہے۔ اس نے سنتے سنتے اگلے دو تین دن کے لیے منتخب سیٹ بھی آج ہی نکال لینے کی ٹھان لی۔ بڑھیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں

تھا، وہ بس ایسے ہی بولے جا رہی تھی جیسے کسی اور کا قصہ سنا رہی ہو، خوشی کی بات پر دھیرے سے مسکرا دیتی، غم کی بات پر اس کا چہرہ دکھ بولنے لگتا لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔۔۔اف اتنی ویران آنکھیں۔۔۔۔۔۔ان میں ویرانی کے سوا کوئی تاثر نہیں آتا تھا۔

بالآخر طاہرہ نے کہانی مکمل کر لی، اس نے اسے پڑھنا شروع کیا وہ اپنے گھر سے نکلی اور مغرب کی جانب مڑی۔ آنندی میڈیکل ہال اس کے سامنے تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ مین مارکیٹ پہنچ گئی۔ مارکیٹ ابھی کھلی نہیں تھی۔ اس کے قدم تیزی سے قدیم پونچھ سے باہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وقت پر سکول پہنچنا اس کی عادت تھی۔ پرانے قلعے کی حدود سے آگے نکل کر اس کے قدم مزید تیز ہو گئے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پونچھ میں وہ گزشتہ کئی سال سے انگریزی پڑھا رہی تھی، دن بھر سکول میں بچیوں کو اس زبان سے آشنا کرنا جو ان کی مادری زبان کے قریب بھی نہیں تھی، ایک کار دارد تھا لیکن اسے پڑھانا آتا تھا۔ وہ فطرتاً استاد تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی طالبات اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ فاطمہ اور اس کا بیٹا گھر کے دو ہی تو لوگ تھے، وہ ماضی کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی تو اس نے بڑی کوشش سے ماضی کو دماغ سے کھرچ کر نکال دیا تھا، اب اسے احمد بھی یاد نہیں آتا تھا جو علی کو ایک ماہ کا چھوڑ کر بھارتی فوجوں کے سرچ آپریشن کا شکار ہو کر منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ احمد کے بعد فاطمہ نے اپنی توجہ کا مرکز علی کو بنا لیا۔ معمولی سی توجہ پر کھلکھلا کر ہنسنے والا علی نہیں جانتا تھا کہ وہ یتیم ہو چکا ہے، کبھی کبھی تو اسے لگتا جیسے احمد چھوٹا ہو کر اس کی گود میں آ گیا ہے۔ علی کو دودھ پلاتے اسے کئی بار احمد کی سرگوشیاں یاد آتیں اور اس کا وجود تپنے لگتا۔ وہ اندر سے کانپ جاتی اور علی کو اپنی چھاتیوں کے ساتھ بھینچ لیتی۔ ممتا اس کی پور پور سے چھلک رہی ہوتی۔ علی میں اس کی جان تھی، وہ صبح جاگتے ہی علی کو دیکھتی رات کو نیند کی دھندلی وادی میں قدم رکھتے ہوئے وہ علی کو دیکھ رہی ہوتی۔ دن بھر علی کا خیال جواب چار ہاتھ پاؤں پر چلنے لگا تھا۔ وہ دن اس کے لیے کتنی بڑی خوشی کا دن تھا جب علی نے پہلا قدم اٹھایا تھا، موٹے موٹے سفید پاؤں گول مٹول روشنی دیتے چہرے پر انتہائی روشن چمکتی ہوئی سبز آنکھیں، سر پر سیاہ کالے بال اس نے علی کی نظر اتاری۔

وقت گزرتا گیا، علی سکول جانے لگا۔ وہ دن بھر بچیوں کو پڑھاتے ہوئے علی کو سوچتی رہتی، اب کلاس میں ہو گا، اب بریک ٹائم میں کھیل رہا ہو گا، کسی بچے سے اس کا جھگڑا نہ ہو جائے، کوئی اسے مار نہ بیٹھے۔۔۔اس کے دل میں وسوسے گھر بناتے اور وہ بے چین ہو اٹھتی تھی۔ علی دوسرے بچوں کی طرح نہیں تھا جو بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ ماں سے دور ہونے لگتے ہیں، وہ جوں جوں عمر میں بڑھ رہا تھا، ماں کے دکھوں کو سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔ایسے میں وہ ماں سے زیادہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔

چھٹی جماعت سے اس نے ایک بھرپور مرد کی طرح گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں، وہ سکول سے تھکی ہاری گھر پہنچتی تو علی موسم کے لحاظ سے چائے کا کپ یا ٹھنڈے پانی کا گلاس لیے آجاتا، اسے اس پر بے پناہ پیار آتا، کتنا سمجھدار ہے میرا علی اور کتنا خیال رکھنے والا ۔۔۔۔۔۔۔اس کا دل تشکر سے بھر جاتا ۔۔۔۔۔۔وہ بنا کہے اس سے پیسے لے کر گھر کی ضرورتوں کے مطابق سامان لے آتا ۔۔۔۔۔۔اس کا کھانے پکانے میں ہاتھ بٹاتا ۔۔۔۔۔۔تو وہ اس کے ہاتھ چوم لیتی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس تمام عرصے میں اس نے پوری کوشش کی تھی کہ علی کو اس کے باپ کی شہادت کا پتا نہ چلے ۔۔۔۔۔۔۔وہ احمد کو کھو چکی تھی علی کو کھونا نہیں چاہتی تھی ۔

وہ ایک سخت گرم دوپہر تھی، آج صبح سے اس کا دل ہول رہا تھا ۔۔۔۔ایک انجانا سا خدشہ اس کے دل سے نکل ہی نہیں رہا تھا ۔۔۔۔۔۔اسے بار بار علی کا خیال آتا ۔۔۔۔۔۔یا اللہ اسے خیریت سے رکھنا ۔۔۔۔۔۔۔یا اللہ میرے علی کو کچھ نہ ہو ۔۔۔۔۔۔۔اسے بات بات پر رونا آ رہا تھا ۔۔۔۔۔بمشکل اس نے چھٹی تک کا وقت گزارا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چلی ۔۔۔۔۔اسے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔۔۔۔وہ گھر پہنچی تو علی کی عجیب حالت تھی وہ غصہ ضبط کرتے کرتے رونے لگا ۔۔۔۔۔۔بہت پوچھنے پر اس نے سوال کیا ۔۔۔۔۔امی، ابو کیسے شہید ہوئے تھے؟

یہ سوال نہیں تھا، گویا ایک پرسکون زندگی کی تباہی کا آغاز تھا ۔۔۔۔۔۔۔اس نے بہت کوشش کی کہ اسے جھٹلا سکے لیکن بتانے والے نے ایسا تیر نہیں مارا تھا جو اثر نہ کرتا ۔۔۔۔۔۔۔اس نے بالآخر علی کو سبھی کچھ سچ سچ بتا دیا ۔۔۔۔۔میری زندگی ہو تم، تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی جی نہیں سکوں گی ۔۔۔۔۔روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی ۔۔۔۔۔علی نے اسے سینے سے لگا لیا ۔۔۔۔۔۔کہنے لگا ۔۔۔۔۔امی، ماں کی اجازت کے بغیر تو جہاد کی بھی اجازت نہیں ۔۔۔۔۔آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔۔اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اسے احمد کی آنکھیں ملیں، اعتماد سے بھرپور، تسلی دیتی ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔اس نے علی کو زور سے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اسے سمجھانے لگی ۔

یہ علی کا سکول میں آخری سال تھا، وہ کالج کی زندگی کی باتیں کرتا رہتا ۔۔۔۔۔۔وہ اپنی امیدوں کو جوان ہوتا دیکھ کر خوشی سے رو دیتی ۔۔۔۔۔سجدے میں جا کر سر اٹھانا بھول جاتی ۔۔۔۔۔اب وہ اپنے سکول میں چھٹی ساتویں کی بچیوں کو اس نظر سے دیکھنے لگی تھی کہ کون اس کے علی کے لیے بہتر رہے گی ۔۔۔۔۔۔اسے خود پر حیرت ہوتی کہ وہ ابھی سے اس کی شادی کے خواب دیکھ رہی ہے ۔۔۔۔اس دن اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا ۔۔۔۔۔اسے لگا جیسے کوئی بہت بڑا سانحہ ہونے کو

ہے ۔۔۔۔۔اس نے سکول سے جلد رخصت لی اور گھر کی جانب بھا گی ،ابھی وہ مارکیٹ کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ اس نے سڑک پر ان درندوں کو دیکھا جنھوں نے اس سے اس کا احمد چھین لیا تھا۔۔۔۔۔۔وہ اگر بچوں کو نہ دیکھتی تو شاید راستہ بدل کر نکلنے کی کوشش کرتی لیکن سکول کے بہت سے بچوں کو انھوں نے ایک لائن میں ہاتھ سر کے پیچھے بندھوا کر سڑک پر بٹھا رکھا تھا۔ایک بچہ زمین پر الٹا لیٹا ہوا تھا جس کا چہرہ اس کی جانب تھا اور اس کے منہ اور سر پر ایک کتے نے پاؤں رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔فل یونیفارم میں وہ ان درندوں کا افسر تھا جس نے لانگ فوجی بوٹ پہنے تھے اور ایک پاؤں سے بچے کے سر اور منہ پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔۔۔۔۔۔پتا نہیں کس ماں کا لال ہے؟ ۔۔۔۔۔اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔

وہ قریب پہنچی تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔۔۔۔۔۔وہ شاہین کی مانند اس افسر پر جھپٹی ۔۔۔۔۔۔امی ی ی ی ی۔۔۔۔۔علی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور ایک بندوق کا بٹ اس کے سر پر پڑا۔۔۔۔۔۔علی کے ساتھ دو ہاتھ اسے بھی گھسیٹ کر گاڑی میں ڈال کر لے گئے ۔۔۔۔۔۔اس کے بعد اس نے علی کی شکل نہیں دیکھی ۔۔۔۔۔۔۔وہ اس سے ان مجاہدین کا پوچھتے رہے جنھیں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔کئی درندوں نے ایک وقت میں اسے کئی کئی بار روندا۔۔۔۔۔۔۔وہ علی علی پکارتی رہ جاتی ۔۔۔۔۔ان کی منتیں کرتی کہ اسے اس کے علی سے ملا دیا جائے ۔۔۔۔۔۔عذاب کے کئی دن گزر گئے تو اہل پونچھ نے سڑکوں پر ایک پاگل عورت کو دیکھا جو لوگوں کو روک روک کر پوچھ رہی تھی ۔۔۔۔۔۔میرے علی کو دیکھا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔وہ بھوکا ہو گا۔۔۔۔۔۔اسے کہو نا گھر واپس آ جائے۔۔۔۔۔۔۔میں اسے کبھی نہیں ڈانٹوں گی ۔۔۔۔۔۔۔پھر کسی اور راہرو سے پوچھتی ۔۔۔۔۔۔میرے علی کو دیکھا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔گھر نہیں آتا پگلا۔۔۔۔۔۔میں احمد کو کیا جواب دوں گی؟

طاہرہ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں مکمل طور پر دھندلا چکی تھیں ۔۔۔۔۔۔اسے اپنے چہرے پر بہتے آنسو انگاروں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔بہت سوچ کر اس نے ایک فیصلہ کیا ۔۔۔۔۔وہ فاطمہ کو گھر لے آئی ۔۔۔۔اپنی ماں کی طرح اس کی خدمت کرنے لگی ۔۔۔۔۔لیکن اس نے فاطمہ کا علاج کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

سیدہ آیت گیلانی۔ساہیوال
DPS کالج ساہیوال

کہانی کی کہانی

میں ایک عرصے سے خود سے ملاقات کا قوی ارادہ رکھتا تھا مگر ہمیشہ آنے سے پہلے ہی وہ لمحۂ ملاقات حیات کی مٹھی سے ریت کی طرح سَرک جاتا تھا۔۔آج میری ریٹائرمنٹ کا پہلا دن تھا۔۔۔۔مدت بعد مجھے اپنے لیے فرصت میسر ہوئی تھی اور میں خود سے ملاقات کا مصمم ارادہ رکھتا تھا۔۔پورے اہتمام کے ساتھ بہت سی اَن کہی باتیں تھیں۔کئی گرہوں کو کھولنا تھا تاکہ مجھے اُن تمام سوالوں کے جواب مل سکیں جو حرفوں، لفظوں اور لہجوں سے بے نیاز، برہنہ صدا کی بازگشت بنے میرے اندر بہت دور تک پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ گونجتے رہتے تھے۔۔۔مجھے اُن تک رسائی اور آشنائی کے لیے اپنی سماعتوں کو مرتکز کرنا تھا جو اس شورِ مسلسل کے باعث میں نہ کر سکا تھا جو برس ہا برس سے میرے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔۔شور سے یاد آیا مجھے ابھی اس بات کی بھی کھوج لگانی تھی کہ یہ شور کیسا ہے؟؟ جبکہ میں تو کبھی بولا ہی نہیں۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری آواز پتھروں کے تعاقب میں نکلی تھی مگر واپسی کا راستہ بھول گئی۔۔اب جبکہ مجھے فرصت کے آثار دکھائی دے رہے ہیں تو مجھے سب سے پہلے آواز کو ڈھونڈنا چاہیے تاکہ ملاقات میں کوئی تشنگی نہ رہے۔۔۔۔۔مجھے کچھ انتظامات کرنے تھے مگر اِس سے پہلے کہ میں پَر تولتا فرصت کے پہلے لمحے کے رخ سے نقاب سَرکتے ہی میں نے اُسے دیکھ لیا جسے کبھی دکھائی نہیں دینا تھا۔۔۔عین اُس وقت جب دسمبر کی ایک روشن صبح دھوپ شوخ ہو کر میری کھڑکی میں آ بیٹھی تھی اور میں اپنے بستر پر نیم دراز اسے اٹکھیلیاں کرتا دیکھ رہا تھا اُس نے مجھے سَت رنگی روشنی سے اپنی چھب دکھا دی۔یقیناً میں اپنے ارادے کو تکمیل تک پہنچا لیتا اگر وہ مجھے نظر نہ آتی۔۔اُسے دیکھ کر مجھے اور بھی بہت کچھ نظر آنے لگا تھا کچھ مبہم کچھ مہمل، لیکن کیا میں واقعی اُسے دیکھ رہا ہوں؟ یا یہ میرا واہمہ ہے۔

نہیں، نہیں یہ وہ تو نہیں۔۔یہ وہ ہو بھی نہیں سکتی۔۔۔۔۔۔کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ وہی ہو اور میں اُسے ٹھیک طرح سے پہچاننے سے قاصر ہو رہا ہوں۔۔۔میں اُسے پہچان پایا ہی کب تھا؟ یہ نا آشنائی بھی بڑی منتقم ہوتی ہے۔اپنی توہین کا بھرپور بدلہ لینے والی۔شاید یہ اُسی کا کوئی وار ہے۔ مگر مجھے تو پہچان میں ملکہ حاصل تھا۔۔کیا میری بینائی کمزور ہو چکی ہے؟

ایک آہ میرے سینے سے نکل کر ہوا کے پہلو سے لپٹی تو ایک پل کو ایک وسوسے نے کسی سائے کی طرح خیال کے آنگن سے گزرتے ہوئے سر اٹھایا۔
لیکن ابھی کل تو موپساں کا افسانہ میں دھندلی شام میں بھی بغیر کسی عینک یا عدسے کے پڑھ رہا تھا۔ دل پہ شاید بینائی کا نقص بار گزرا تھا۔ تبھی تو فوراردپیش کر دی تھی۔ ہم بھی عجیب ہیں جن چیزوں کو ہمارے دل تسلیم نہ کریں اُن کی تردید کی دلیلیں اپنے اندر پہلے سے ہی محفوظ رکھتے ہیں۔
کہیں اُس کے معاملے میں بھی تو ایسا ہی نہیں ہے۔۔ اُسے دیکھ کر میرے دل نے دلائل کے انبار لگا کر اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک بار میں چونکا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے خود کو تسلی دی۔
یہ التباسِ نظر کے سوا کچھ نہیں۔
کیا تردید، تصدیق شدہ حقیقتوں کی تاویل ہو سکتی ہے؟ حقیقتیں بھی وہ جو نادیدہ ہوں؟
کیا صرف دید ہی ہونے کی دلیل ہے؟؟
میں ایک دم اچھلا۔۔۔ یہ لہجہ، یہ الفاظ یہ انداز تو ہو بہو اُس کا ہے۔
کیا وہ واقعی یہیں کہیں ہے۔؟
مگر ایسا کیسے ممکن ہے؟
اُسے تو یہ جہاں چھوڑے کئی سال ہو چکے۔۔۔ اُسے رخصت ہوئے تو کئی موسم گزرے۔ ہجرت سے ہجر تک کتنی رتیں پلٹ پلٹ کر آ جا چکیں۔ میرے سامنے ہی تو اُسے ندی کی گود سے نکالا گیا تھا جس کے کنارے پڑے پتھروں کو وہ ایک ایک کر کے ندی میں پھینک کر کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ مبہم کہانیاں۔ جن کے کرداروں کو وہ اپنا دوست کہا کرتی تھی۔ کبھی اُن سے روٹھتی کبھی مناتی اور کبھی خفا ہو کر روتے ہوئے چھوٹی سی ناک کو سرخ پکوڑے جیسا کر لیا کرتی تھی جو اُس کی سفیدی جیسی رنگت کو اور بھی حسیں بنا دیا کرتا تھا۔ جب بھی وہ اُن سے خفا ہوتی ڈھیروں شکایتیں قرطاس کے کانوں میں انڈیلا کرتی تھی۔ ہاں سچ یاد آیا ایک بار تو اُس نے روٹھ کر یہاں تک لکھ دیا تھا۔
ایک تو یہ میرے دوست بھی ناں! افففف اللہ!! کتنے سادہ ہی ہیں۔ قدموں سے لپٹے ڈھلوان رستوں پہ بل کھاتے موڑوں کی طرح۔ جیسی تم سادہ ویسے تمہارے دوست سادہ۔ میں اُسے کتنے ہی دن اِس بات پہ ہنسا تا رلاتا رہا تھا۔ وہ روتی تھی اور میں ہنسا کرتا۔ اگر اتنا ہی ستاتے ہیں تو تم ان کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی ہو؟ میں اکثر اُسے کہتا تھا۔
چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ میری سانس کے سارے بھنور اِنہی کے دریا میں ابھرتے ہیں۔ میرے لفظ اِنہیں چھو کر امر ہوتے ہیں۔ کیا کروں جتنے بھی سنگدل ہیں۔ ہیں تو میرے۔
دماغ کا خلل ہے تمہارا۔ میں اُس کی ہر بات سنی اَن سنی کر دیتا اور اُس کے قہقہے دور تک یوں

میرے پیچھے چلتے تھے جیسے کسی بیگانے انجانے کے پیچھے گاؤں کے شرارتی بچے۔ اُس کے کردار ہمیشہ علامتی نقابوں میں چھپے ہوتے تھے اور ہمیشہ وہ اپنی لکھی ہوئی کہانیاں ضد کر کے مجھ سے پڑھواتی تھی۔ اور میں ہر سطر پر الجھ کر آخر اُس سے لڑ پڑتا تھا کہ بھلا ایسی بے تکی کہانیاں لکھنے کا مقصد کیا ہے؟

کہانیاں کب مقصد کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

پاگل !!! کہانیاں تو صرف اس لیے لکھی جاتی ہیں کہ وہ کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی کہانیاں۔۔۔ وہ سنجیدگی سے فلسفہ جھاڑتی جو میرے سر سے گزر جاتا۔

ہونہہ کہانیاں۔۔۔ تم صرف کاغذ کالے کرتی ہو۔۔۔ لکھنا تو تمھیں آتا ہی نہیں۔۔۔ میں ہر بار کہانی پڑھتے ہوئے آخر میں اُسے چڑا کر گویا اپنی کم فہمی کا بدلہ لیتا تھا۔

تمھیں کیا معلوم کہانی کیا ہوتی ہے؟

" پھر تم ہی مجھے سمجھا دو۔۔۔" میں طنزاً کہتا۔

جوانی اور کہانی بر وقت سمجھ میں آ جاتیں تو پھر روتا کون؟ اُن کے بھید تو ہمیشہ سمے کی لکیر کے اُس پار کھلتے ہیں بدھو!

جو سمجھ آ گئی وہ کہانی ی ی ی کیا ہوئی، وہ جوانی ی ی ی کیا ہوئی۔ وہ لہک لہک کر کہتی۔

دیوانی۔۔۔ شدین۔۔۔۔۔ میں دل میں اُسے کئی نام دیتا۔

اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ لکھتی کیوں ہو؟؟

تا کہ لوگ سمجھیں نہ سمجھیں تو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اُس کے مسکراتے گالوں کے ڈمپل کچھ مزید گہرے ہو جاتے۔

حد ہے لوگوں کو سمجھانا مطلوب ہے تو الجھاتی کیوں ہو؟ میں اُس کی بے تکی منطق سے جھنجھلا ہی تو جاتا تھا۔

بن مانگی نعمت اور بے قیمت سودے کی کس کو قدر۔ برہنہ خیال ہو یا خوبصورتی زیادہ دور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔ ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہے۔ ابہام کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا خیال کے بدن پہ باقی رہ جائے تو نہ صرف کشش باقی رہتی ہے بلکہ گاہے گاہے حسن کے زاویے بھی ابھر کر نگاہ کو خیرہ کرتے رہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ لوگ میری کہانی کے عشق میں اس کے ساتھ بوڑھے ہوں۔ وہ بے نیازی سے کہا کرتی تھی۔۔

بوڑھے ہوں۔۔۔۔۔ مطلب؟

" بڑھاپے کی محبت افیون کے نشے جیسی ہوتی ہے۔ سکون آمیز، پر کیف نیند میں ڈوبی، سوتی

جاگتی۔۔۔"

افوہ اووووو۔۔۔ ہر بات ہی الٹی۔ میں اٹھ کر بھاگنے کا ارادہ کرتا۔تو وہ حسبِ عادت نیت بھانپ کر چائے کا کپ تھماتے ہوئے عین میرے سامنے آ بیٹھتی۔ میرے واک آؤٹ کرنے کے سارے ارادے بھی اس کے بیٹھتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے اُس کی لایعنی بحث سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی تو میں جاتا کیوں نہ تھا؟ یہ سوال بھی ملاقات والی فہرست میں شاید شامل تھا۔فہرست کا خیال مجھے ماضی سے پھر حال میں گھسیٹ لایا۔مگر صرف ایک پل کو۔یقین مانو سچ کہ رہی ہوں جو مزہ بڑھاپے میں محبت کا ہے وہ جوانی میں نہیں ہے۔ یاد کے کھنڈر سے اس کی آواز ابھری۔

وہ کیسے؟

جوسکون اور نیند کمبخت جوانی کی محبت چرا لیتی۔ بڑھاپے والی چپکے سے وہ تھما دیتی ہے۔

اسی لیے تمھاری کہانیاں کوئی نہیں پڑھتا۔۔۔فضول بک بک کے سوا کچھ نہیں ہوتا اِن میں۔

کوئی بات نہیں۔تم جو ہو۔تم پڑھو گے میری ساری کہانیاں بار بار۔

احمق!!۔۔۔۔میں بڑبڑاتا

کیا کہا؟

افففف!!

سمجھ سے بالاتر ہے کہ لڑکی ہو کر تم اتنی گنجلک کیوں ہو؟

کیونکہ میں کہانی ہوں۔۔۔۔

وہ قہقہہ لگاتی۔

میں اپنی آواز کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا روز ندی کنارے آ بیٹھا ہوں جو اِن پتھروں کی تلاش میں نکلی تھی جنہیں چھوتے ہی اُس کی سوچ کے فلک پر کہانیاں طلوع ہوتی تھیں شاید اِسی لیے وہ جاتے ہوئے اِنہیں جیبوں میں بھر کر ساتھ لے گئی تھی۔ جیسے ہی آواز واپس آ گئی میں ندی کے کان پر منہ رکھ کر اُسے بتاؤں گا کہ میں اُس کی کہانیاں بار بار پڑھتا ہوں کیونکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔

عین اُس وقت جب پانی کی سطح پر بھنور بنتے ہیں وہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے بدھو کہہ کر بلاتی ہے اور مسکراتی ہے۔

ہائے ے ے یہ بھنور!!

یہ اُس کے گالوں کے ڈمپل جیسے ہیں۔

سرفراز بیگ، پیرس، فرانس

ہزاروں خواہشیں ایسی

دونوں نے گاڑی ہوٹل گل نور کے سامنے پارک کی۔ یہ مارکیٹ مری روڈ پہ ناز سینما سے تھوڑا آگے واقع ہے۔ جہاں ایک طرف تو الیکٹرانک کی دکانیں ہیں۔ اس کے بالکل سامنے سڑک کے اس پار جیولری کی دکانیں ہیں۔ یہ جگہ مری روڈ کی مصروف ترین جگہ ہے۔ ماروی نے اجمل کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اجمل بھی ماروی کے دیکھنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں اسے کیا سمجھانا چاہ رہی ہے۔ اجمل نے آہستگی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بالکل اس کی نقل کرتے ہوئے ماروی نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ دونوں گاڑی سے باہر آئے اجمل نے الیکٹرک چابی سے دور سے ہی گاڑی بند کی ایک ٹوں ٹوں کی آواز آئی۔ ماروی نے جدید انداز کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی، اونچی ایڑھی کی جوتی، ماروی کا رنگ نہ گورا تھا نہ ہی کالا بلکہ ایک بہت ہی پرکشش رنگت تھی جو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ دبلی پتلی بھی نہیں تھی لیکن آپ اسے موٹی بھی نہیں کہہ سکتے۔ قمیض آدھے بازووں والی تھی اور بانہوں کی گولائیاں بہت ہی بھلی لگ رہی تھیں۔ اس پہ جو سب سے زیادہ کمال کی بات تھی وہ اس کے دونوں بازوؤں میں سونے کے موٹے موٹے کڑے۔ جب اس نے اپنی زلفوں کو سنوارنے کے لیے اپنا ایک بازو اوپر کی طرف اٹھایا، تو اس کی کلائیوں میں سونے کے کنگنوں کی کھنک دور تک سنائی دی۔ دونوں میاں بیوی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے الیکٹرانک کی دکان میں داخل ہوئے۔ دکان کے اندر چلتے چلتے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں دیوار کے ساتھ بڑے بڑے ایل سی ڈی ٹی وی نصب تھے۔ دونوں دیوار پہ لگے ہوئے مختلف کمپنیوں کے ٹی وی دیکھنے لگے۔ ان کو دیکھ کے ایک سیلز مین ان کے قریب آیا لیکن دکان کے مالک نے دونوں کو دیکھا تو اندازہ لگایا کہ دونوں میاں بیوی جوان، ماڈرن اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس بھی ہیں۔ وہ ان کے قریب آیا اور سلام دعا کے بعد سیلز مین کو کہنے لگا ''تم دوسرے گاہکوں کو دیکھو ان کو میں ڈیل کرتا ہوں۔ سیلز مین دوسری طرف چلا گیا حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا ایک تو لڑکی بہت خوبصورت تھی دوسرا اس کا کمیشن بھی مارا گیا تھا۔ خیر دکان کے مالک ان کے قریب آیا اور پوچھنے لگا کہ میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں تو اجمل نے کہا، ''آپ میری بیوی سے پوچھیں، جو بھی ٹی وی یہ پسند کرے وہ ہمیں پیک کر دیں''۔ دکان دار ان کو مختلف قسم کے ٹی وی دکھانے لگا، ایل سی ڈی، ڈیجیٹل، لیڈ، ایسے بھی ٹی وی موجود تھے جن پہ سکائیپ اور فیس بک بھی

استعمال ہوسکتا تھا۔ یہ ذرا مہنگے تھے لیکن بہت ہی خوبصورت، سلم اور جدید سہولیات سے مزین تھے۔اجمل اور ماوری نے دکان کے مالک سے اجازت لی اور دوکان کا چکر لگانے لگے۔ دکان دار کہنے لگا'' آپ کی اپنی دکان ہے گھوم پھر لیجیے، میری ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں''۔ دونوں نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا جس کا مطلب تھا کہ وہ ان دونوں کی جان چھوڑ دے۔ دکان کے مالک کو یہی امید تھی کہ ڈیڑھ دو لاکھ کا سامان بک جائے گا کیونکہ سکائیپ اور فیس بک والے ٹی وی ایک لاکھ دس ہزار سے کم کے نہیں تھے۔ دونوں میاں بیوی کئی اقسام کے ٹی وی دیکھتے رہے۔ پھر ماروی کو ایک ٹی وی پسند آ گیا۔ اس نے اجمل سے کہا،''اجمی یہ ٹی وی ٹھیک ہے ''۔تو اس نے کہا،''جیسے تمہاری مرضی لیکن میرے خیال میں یہ والا ٹی وی اچھا ہے، یہ سستا بھی ہے اور کمپنی کی گارنٹی بھی ہے''۔ ماروی منہ بسور کے بولی مجھے تو یہی ٹی وی پسند ہے کیونکہ بھائی جان کے گھر بھی یہی ٹی وی ہے''۔''بھئی وہ مہنگا ٹی وی خرید سکتے ہیں ان کی رشوت کی کمائی ہے میں حلال روزی کماتا ہوں بڑی مشکل سے کمیٹیاں ڈال کے رقم اکٹھی کی ہے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے''۔''آپ تو ہاتھ دھو کے میرے بھائی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ اس کو گفٹ دیتے ہیں تو رشوت ہوجاتی ہے''۔''میں تمہارے بھائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر اس لیے پڑا ہوا ہوں کہ کہیں وہ گندا نہ ہوجائے۔ پھر تم کہوگی کہ میرے بھائی کو گندا کر دیا''۔ دکان دار دور کھڑا میاں بیوی کی گفتگو سن رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ ہر گھر کی یہی کہانی ہے۔ ماروی پھر بولی ''آپ کو جگت بازی کی سوجھ رہی ہے۔ آپ بات کو گھما رہے ہیں۔ میں نے یہی ٹی وی لینا ہے ۔میری بچے ماموں گھر جاتے ہیں تو بڑی حسرت سے اس ٹی وی کو دیکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے کسے چیز کو ترسیں''۔''ہاں پھر بھائی سے کہ دو تمہیں یہ مہنگا ٹی وی لے دیں''۔''آپ بھی کمال کرتے ہیں ابھی حال ہی میں تو میری امی نے مجھے یہ دو سونے کے کڑے بنا کے دیے ہیں ۔اب میں ان کو ٹی وی فرمائش کر دوں''۔''اور دو کڑے میں نے بنا کے دیے ہیں، ان کا ذکر ہی نہیں''۔ ماروی نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے کہا،''دیکھ لیں دونوں سونے کے ہیں لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ آپ والے ہلکے ہیں اور امی نے جو دیے ہیں بھاری ہیں۔ پورا بیس ہزار کا فرق ہے''۔''اچھا بھئی میں ٹھہرا غریب۔ نہ کرتی مجھ سے شادی''۔''مجھے کیا پتا تھا آپ اتنے کنگلے ہیں۔ میری قسمت پھوٹ گئی تھی۔ میرے تو کئی رشتے آئے تھے۔ ماموں کا لڑکا تو پاگل تھا۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ سی ڈی اے میں ملازم ہے اور اب تو سنا ہے ایک پلاٹ بھی ملا ہے اس کو۔ جب بیچے گا تو ایک کروڑ ملے گا''۔''ہاں تو اب کر لو اس سے شادی۔ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں''۔''آپ تو بہانے ڈھونڈتے ہیں مجھے چھوڑنے کے۔ اگر بچے نہ ہوتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں کب کی

آپ کو چھوڑ کے چلی گئی ہوتی''۔ ''ہاں اب بھی اندر ہی اندر اس سے عشق میں جل رہی ہو''۔ ''اجمی آپ نے بہت گھٹیا بات کی''۔ ''اور تم نے بڑی ودھیا بات کی ہے''۔ بھرے بازار میں خاوند کی عزت کا کوئی خیال ہی نہیں''۔ ''میری امی ٹھیک کہتی تھیں۔ انہیں شروع ہی سے آپ پسند نہیں تھے بس ابو کی وجہ سے میری شادی ہوگئی''۔ ''اچھا اب کیا ارادہ ہے، ٹی وی لینا ہے یا یہی تقابلی جائزہ جاری رہے گا''۔ ''ٹی وی تو میں لے کر جاؤں گی لیکن اپنے پیسوں سے''۔ ''ماروی یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ یہ گھر نہیں دکان ہے۔ ڈراما نہ کرو''۔ ''ڈراما تو آپ میرے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ میں ہی جانتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ کیسے گزارا کر رہی ہوں''۔ ''مجھ سے بھی تو پوچھو کہ میں تمہارے جیسی بد دماغ لڑکی کے ساتھ کیسے گزارا کر رہا ہوں''۔ ''ہاں میں بد دماغ ہوں لیکن آپ بھی کوئی فرشتے نہیں ہیں''۔ ''اچھا اب ٹی وی لینا ہے''۔ ''ہاں لینا ہے لیکن میں اپنے پیسوں سے لوں گی''۔ ماروی تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ میں بات کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم بات کو بڑھا رہی ہو''۔ ''خود تیلی لگا کے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور بعد میں معصوم بنے پھرتے ہیں''۔ ''اچھا میں جا رہا ہوں میں دیکھتا ہوں تم کیسے ٹی وی لیتی ہو''۔ ماروی کو یہی لگا کہ اجمل مذاق کر رہا ہے لیکن وہ واقعی دکان سے باہر نکل گیا۔ ماروی نے ایک دو دفعہ بلایا بھی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ دکان دار قریب آیا تو کہنے لگا، ''کوئی بات نہیں میاں بیوی میں ایسا چلتا ہے''۔ ماروی نے رونا شروع کر دیا۔ ''یہ آدمی بہت گھٹیا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ دس سال ہو گئے ہیں۔ میرے ماں باپ اگر میرے ساتھ نہ ہوں تو میرے بچے بھوکے مر جائیں۔ اس نے مجھے سونے کے یہ دو کڑے کیا بنا دیے ہیں ہر وقت طعنے دیتا رہتا ہے۔ حالانکہ میرے ماں باپ نے مجھے اس سے زیادہ مہنگے کڑے بنا کے دیے ہیں''۔ ''اچھا خیر چھوڑیں، آپ کا کیا ارادہ ہے''۔ ماروی نے کہا، ''ٹی وی تو میں لے کر جاؤں گی ۔ بچوں سے وعدہ کر کے آئی ہوں''۔ اس نے جھٹ سے دونوں سونے کے کڑے اتارے اور دکان دار کے ہاتھ میں دیے۔ کہنے لگی، ''بھائی سونے کے کڑے میرے بچوں کی خواہش کے آگے کچھ نہیں۔ یہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے ہیں۔ مجھے میرے ماں باپ نے بنا کے دیے ہیں۔ اس کے کڑے میں اس کے منہ پہ دے ماروں گی۔ آپ ان کی مالیت لگوا لیں۔ نہ مت کیجیے گا۔ آج میں اپنے میاں کو بتاؤں گی کہ میں کیا چیز ہوں''۔ دکان دار پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن اس عورت کی حالت اور دونوں میاں بیوی تکرار سن کے اسے ایسا لگا کہ اس کا میاں سہی معنوں میں گھٹیا آدمی ہے۔ اس نے دونوں کڑے ہاتھ میں تھامے لیکن کچھ سوچ کے واپس کر دیے۔ کہنے لگا، ''میں یہ نہیں کر سکتا''۔ ''چلیں میں کسی اور دکان پہ جا کے بھیک مانگتی ہوں''۔ پھر دکان دار نے کچھ سوچا اور کہنے لگا، ''لائیں''۔ یہ کہ کے اس نے کڑے واپس لے لیے اور کہنے لگا، ''ٹھیک ہے

میں اپنی تسلی کے لیئے ان کی قیمت لگوا لوں اگر آپ کو برا نہ لگے"۔تو ماروی بولی ،"جی ضرور"۔دکان دار نے ملازم کو کہا" ذرا خیال رکھنا میں ابھی آیا"۔جب وہ چلا گیا تو ماروی دکان کے اندر مختلف چیزوں دیکھتی رہی۔اس دوران دکان دار واپس آیا اور کہنے لگا،"آپ کو جو ٹی وی پسند ہے وہ میں پیک کروا دیتا ہوں۔رقم زیادہ ہے اس لیے آپ کچھ اور بھی پسند کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں"۔ماروی نے ٹی وی پسند کی اور ساتھ چند اور چیزیں بھی۔دکان دار نے ساری چیزیں پیک کروائیں اور ڈیلیوری وین بلا کر اس میں رکھوا دیں۔جب دکان دار ان کاموں میں مصروف تھا ماروی اس دوران اس کے کاونٹر پہ بیٹھ کے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد دکان دار آیا اس کو سارے سامان کی رسید دی اور کہا،"آپ سکون سے گھر جائیں۔میں جو کر سکتا تھا کر دیا۔ اب گھوڑا گھاس سے دوستی کر لے تو کھائے گا کیا"۔ماروی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،"بھائی آپ نے اتنی بڑی فیور کی ہے۔میں تو آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔اگر آج یہ کڑے لے کر مجھے ٹی وی نہ دیتے تو میں اپنے بچوں کو کیا منہ دکھاتی"۔اتنا کہ کر اس نے رسید اٹھائی اور باہر آ کر ڈیلیوری وین والے کو گھر کا پتا سمجھایا اور خود ٹیکسی میں اس کے آگے آگے ہولی۔اس کے جانے کے بعد دکان دار دکان کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔شام کو کلوزنگ کرنی تھی۔حساب کتاب میں پیسے کم تھے پھر اس کو خیال آیا ہاں وہ سونے کے کڑے بھی لیے تھے۔وہ سڑک کے اس پار سنار کی دکان پہ گیا جس کے پاس وہ پہلے گیا تھا اور اس کو کڑے دیے اور کہا، وہ ان کڑوں کے بدلے اسے پیسے دے دے تا کہ وہ کلوزنگ کر لے۔سنار نے کڑے ہاتھ میں لیے اور کہنے لگا،"یار کیوں مذاق کرتے ہو، وہ پہلے والے کڑے لاؤ نا جو پہلے لائے تھے"۔وہ ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔

مائکرو کہانیاں گلزار ملک

معدومیت

میرے ساتھ کچھ عرصے سے بڑا عجیب سا چکر چل نکلا تھا۔ میں سوتا تو اچانک کسی شدید احساس کے زیر اثر اٹھ بیٹھتا۔ کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک اسے بند کر کے ادھر ادھر کسی شے کو ڈھونڈنے لگتا' کبھی کبھار تو کھانا کھاتے ہوئے نوالہ ابھی منہ کے قریب ہی لاتا کہ مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ کوئی ناگزیر شے یا ضروری کام ہونے سے رہ گیا ہے مگر کیا کوشش کے باوجود یاد نہ آتا۔ میں کھانا چھوڑ کر اسے سوچنے بیٹھ جاتا۔ سیر کے لیے نکلتا تو سیر کہیں راہ کی دھول میں کھو جاتی اور کسی اہم شے کے بھول جانے کا احساس غالب آنے لگتا۔ نہانے کے لیے واش روم میں داخل ہوتا تو نہائے بغیر تولیہ لپیٹے کوئی شے کھوجنے کمرے میں نکل آتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ گھر والے میری ان اوٹ پٹانگ حرکات سے شدید پریشان تھے اور دبی دبی آواز میں کسی ڈاکٹر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن میرے برا منا جانے کے ڈر سے ضد نہیں کرتے تھے۔ ایک روز میں ان سے ذکر کیے بنا ڈاکٹر سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ ڈاکٹر میری بات سن کر کتنی دیر پنسل منہ میں دبائے سوچتا رہا پھر اس نے ''بڑھاپا'' تشخیص کیا اور کچھ سکون آور گولیاں دے کر مجھے گھر لوٹا دیا۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے اس احساس کی پیدائش اسی روز ہوئی جب مجھے اپنے لنگوٹیے یار کی اچانک موت کا علم ہوا تھا۔ ہم نے ہر کام ساتھ ساتھ کرنا سیکھا تھا بچپن' لڑکپن۔ جوانی' کھیل تماشے تعلیم' نوکری شادی' حتی کہ بچے تک ایک ہی ترتیب میں پیدا کیے تھے لیکن وہ مجھ سے پہلے مر گیا ۔ یقیناً اس احساس کا تعلق کہیں نہ کہیں سے اس کی ذات سے بھی وابستہ تھا۔ بعد ازاں میں نے خیال کیا کہ شائد اس کا تعلق ہمارے مشترکہ بچپن سے ہو۔ تبھی میں واپس ان کھیت کھلیانوں اور گلیوں کی جانب لوٹا جہاں میں نے بچپن اور لڑکپن گزارا تھا۔ میں وہ مکان دیکھنے گیا جہاں میں نے زندگی کے ابتدائی ایام گزارے وہ میدان اور گلیاں گھومتا رہا جہاں ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے اور اب اپنی اپنی باری پر معدوم ہونے والے تھے جب میں اس ویران احاطے میں گیا جو اب بھی جوں کا توں تھا جیسے وقت اس سے پہلو بچا کر گزر گیا ہو۔ تو میرا سانس پھولنے لگا۔ تبھی مجھے یقین ہو گیا کہ میری بھولی بسری یاد کا کوئی نہ کوئی تعلق اس احاطے سے جڑا ہوا تھا جسے ہم دونوں برسوں پہلے چھوڑ گئے تھے اور پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔ تبھی میں خود کو زیادہ دیر تک روک نہ سکا اور طفلانہ تجسس کے ساتھ احاطے کے کونوں کھدروں کی مٹی کو اپنی نگاہوں سے چھاننے کے لیے اس میں اترا۔ میں نے درختوں کے تنوں کو سراسیمگی سے دیکھا' برتنوں کے ٹوٹے ٹکڑوں کو تحیر سے الٹا پلٹا اور کافی تلاش بسیار کے بعد آخر کار میں پتھر کی اس چھوٹی سی سلیب کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا جس پر میں نے

سلیٹی سے کبھی بہت سی لکیریں کھینچیں تھیں اور جن کی گنتی نہ ہونے کی وجہ سے میں اپنے دوست سے بری طرح ہار گیا تھا میں اسے جوں کا توں چھپا پا کر بہت حیران ہوا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسے کسی نے چھوا تک نہ تھا۔ تبھی وہاں پڑا اپنا بچپن ڈھونڈ لینے کے باعث میرے اندر کسی انجانی سی خوشی نے جنم لیا اور میری روح کو قرار آ گیا۔ میں کسی انجانے جوش سے سلیب کو بغل میں دبا کر اپنے دوست کو یہ بتانے وہاں سے نکلا کہ کیا کچھ ابھی تک گنتی سے رہ گیا ہے لیکن، یہ بھول کر کہ وہ تو معدومیت کے سفر پر نکل چکا تھا۔

●

اجنبی

مجھے گوشہ نشین ہوئے کئی سال ہو چکے تھے اور مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ میں اسے کبھی ملا بھی تھا یا نہیں لیکن تھری پیس اور رے بین کے قیمتی چشمے پہنے وہ ایسے ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ مجھے اچھی طرح سے جانتا ہو۔ میں نے اندر آنے کے لیے اسے راستہ دیا، وہ سال خوردہ دیواروں کو اچنبے سے دیکھ رہا تھا۔ چھت سے چمٹے جالے کافی عرصے سے کسی نے اتارنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ بیٹھنے کے لیے چار پائی گھسیٹتے ہوئے میں نے چند مزید سوال اس سے کیے جن کے جوابات سے مجھے لگا وہ واقعی مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا لیکن میں اس کی پہچان کو ابھی تک اپنی یاداشت کے نہاں خانوں سے برآمد نہ کر سکا تھا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ مجھے کوئی اور ہی سمجھ رہا ہو؟

''ماسٹر جی! آپ بہت بھولے انسان ہیں' میں آپ کو اور کوئی کیوں سمجھنے لگا۔ آپ بھلے مجھے بھول جائیں لیکن میں آپ کو نہیں بھلا سکتا۔ بلکہ آپ کی جگہ کوئی اور ابھی ہوتا تو میں اسے بھی نہ بھول پاتا۔''

میں اس بات سے پھر تذبذب میں پڑ گیا کہ اس کے کہنے کا کیا مطلب تھا، کیا یہ میرا کوئی پرانا شاگرد تھا یا پھر کوئی دور نزدیک کا رشتے دار۔ ابھی وہ چار پائی پر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ وہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی دروازے کی جانب بڑھا پھر تین چار مزدور نما افراد گھر میں داخل ہوئے وہ ہماری جانب دیکھنے کی بجائے گھر کی دیواروں اور چھتوں کو گھورنے لگے اور پھر اپنے کام میں جت گئے، انہیں اپنے کام میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ پھر وہ باہر سے گھر کی زیبائش کی اشیا لا کر رکھنے لگے۔ چند گھنٹوں بعد جب میں نے ارد گرد نظر دوڑ آئی میری آنکھیں دھندلا سی گئیں، اس لمحے میں خود کو ایک ایسے گھر میں پا رہا تھا جو میری جوانی کی ان اشیاء سے سجا ہوا تھا جنھیں میں اپنی بیوی کے ساتھ عرصہ ہوا کھو چکا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی دیوار پر گلاب کے پھولوں والے مدہم وال پیپر کو دیکھا جو شادی کے پہلے سال میری بیوی کی فرمائش پر آیا تھا، آہنی بیڈ کے زیبائشی فریم اور گاؤ تکیے جنہیں وہ جہیز میں ساتھ لائی تھی۔ چند گھنٹے پہلے والا ویران اور اجڑا ہوا گھر اب کہیں غائب ہو چکا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جسے میں بھلا

چکا تھا میں ان بھولی بسری اشیا کے درمیان اجنبی کا ہاتھ تھامے اس لمحے اپنی زندگی کے بہترین دنوں میں پہنچ چکا تھا۔ تبھی میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی روشن ماہتاب چہرے پر مسکراہٹ لیے ہوئے ۔میں اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اس لمحے کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ وہ اجنبی جو بھی تھا یقینا کوئی فرشتہ ہی تھا جس نے میرے لیے وقت کا رخ پلٹ دیا تھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن اب میں اسے پہچان چکا تھا۔ میں نے دھندلی نگاہوں سے اس کے ہاتھوں کو احسان مندی کے جذبات سے دبایا اور اپنی بیوی کے پہلو میں کھڑے ہو کر خود کو ایک لامتناہی سفر کے لیے تیار کرنے لگا۔

●

محبت، دانائی اور موسم

سرد، سپاٹ دیو ہیکل مشینوں کے بیچ کھڑے، جس روز میرے دل پر یہ راز کھلا کہ اس کی نایاب، بے نام سی محبت اب میرے اندر کہیں مر چکی اسی روز جانے کیسے وہ دوبارہ میرے سامنے چلی آئی، لمبے کولہوں کو چھوتے چمکدار بالوں کی گھٹا کے ساتھ۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، باغ پھول اور پھلوں سے پہلے کی طرح اب بھی لدے ہوئے تھے، برکھا رت امبر پر ہلارے لے رہی تھی وجود کو چھوتی نرم و نازک ہوا گدگدی کرتی ہر سو اب بھی موجزن تھی ۔ نیلا گھگن دھرتی کی گود کو سہلا رہا تھا، بھنورے دیوانے روح کے گداز کا بوجھ لیے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ اور ان سب کے بیچ وہ کافرسی دیو مالائی مورت کی طرح بازو کھولے کھڑی کہہ رہی تھی "میرا مرد۔ میری جان۔ تم کہاں کھو گئے تھے میرے محبوب" میں اس پل بیگانوں کی طرح بس اس کے چہرے کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔ مکھن ملائی جس کے چہرے کے تل کو دیکھ کر شاعروں نے کویتائیں لکھی تھیں جس کے بدن کی بناوٹ اور خوشبو سے میرے اندر کبھی ان گنت کہانیوں نے جنم لیا تھا اس کی جھیل سی آنکھوں سے سورج تپش پاتا تھا اور لب جو شہد سے لبریز تھے مکّس نے انہیں سے مٹھاس کشید کرنا سیکھی تھی۔ وہ پلکیں اٹھاتی تھی تو تاریکی کی اوٹ سے صبح صادق نمودار ہوتی۔ چاند اس کے چہرے سے چاندی پاتا لیکن جس دن میرا سامنا اس وحشی سے ہوا جسے لوگ بھوک کہتے ہیں اس دن سے میں خود کو کسی بھی طرح کی دوسری آگ سے گرما نہیں سکا۔ ہر شے بالکل خالی، سرد اور بے رحم ہو گئی ۔خوبصورت ترین موسم گرما بھی خزاں اور ضعف محسوس کرنے لگا۔ اور موسم بہار اب ماسوائے دن رات کے گزر جانے کے احساس کے کچھ بھی نہیں تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی میری طرح گہنا جاتی۔ ہر سو چھائی، خاموشی میں لپٹی اس تاریکی سے واپسی اب میرے لیے ممکن نہ تھی۔ پھر میں اس کی جانب اپنی پشت کر کے کسی اجنبی کی طرح دل ہی دل میں یہ کہتے ہوئے چل دیا "بہت دیر ہو گئی سوہنے! میری جان! سچ تو یہ ہے جس دھرتی پر بھوک اگتی ہے وہاں، محبت، دانائی اور موسم مر جاتے ہیں"۔

سیدہ صائمہ کاظمی

نوید

سہ پہر سے وہ دہلیز سے چمٹی کھڑی تھی۔ جارجٹ کے سفید دوپٹے میں خود کو اچھی طرح لپٹائے وہ بوا کی منتظر تھی...! بوا جو اس کی آخری امید تھیں۔ آخری رہ جانے والا سہارا!

کھٹ...کھٹاک...!! کھٹکے کی آواز نے سینے کے اندر دل کو لرزا دیا۔

کانپتے ہاتھوں سے دہلیز پر گرفت مضبوط کیے اس نے اپنے دل کو خود ہی ڈھارس دی اور کوٹھڑی کے دروازے کی معمولی سی درز سے آنکھ لگائی۔ بیرونی دروازے کا اکلوتا رہ جانے والا پٹ کھڑکھڑایا تھا. شاید ہوا کی وجہ سے۔ سینے سے گھٹی گھٹی سانس خارج ہوئی۔

اگرچہ خطرہ ٹلا نہیں تھا مگر خوف کی وہ سرسراتی لہر ایک لمحے کو جان لے گئی تھی۔ وہ کیفیت اب دوبارہ سے انتظار میں ڈھل گئی تھی۔

''جانے بوا کہاں رہ گیں۔ اب تو شام سر پر ہے۔ اگر انھیں آتے آتے رات ہوگئی تو؟ یا اگر وہ لوٹ ہی نہ پائیں تو؟

اس سوچ کے ساتھ موت جیسی ایک اور سرد لہر اس نے رگ رگ میں اترتی محسوس کی تھی۔

''ہائے بوا! کیا تھا جو ہمیں بھی ساتھ لیے جاتیں؟ اس سولی پر لٹکے رہنے سے تو بہتر تھا جو بھی ہوتا دونوں ساتھ تو رہتے''۔

روزے کی کیفیت نے پیٹ میں بل ڈال رکھے تھے۔ اس پر بوا کا انتظار اور سرسراتے خوف کے سائے۔

پرسوں اس وقت تک کیا حالات تھے اور اب؟

سانس کی رفتار بھی دبے قدموں جیسی تھی۔

آہ پرسوں! اسے رمضان کی پہلی شب یاد آئی.

''نور العین!'' انابی نے اسے پکارا تھا۔

''بٹیا ذرا حقہ تو گرم کردو۔ بڑے میاں جی شام سے خود بھی گڑگڑا رہے ہیں''۔

انابی نے قدرے بیزار لہجے میں اس کے گوش گذار کیا تھا۔

''جی! بہت بہتر! آپ چلیے ہم ابھی گرم کیے دیتے ہیں''۔ وہ مسکرا دی تھی

انابی اس کے والد جودت عباس خاں صاحب کی پھوپھی تھیں۔ عرصہ ہوا، اُن کے شوہر محبت خاں کی ریل کے حادثے میں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ اس وقت وہ محکمہ ریلوے میں ٹی ٹی تھے۔ مگر حادثے

کے بعد سے صاحب فراش تھے۔اس حادثے کے بعد ان کے بھتیجے میاں جودت عباس انھیں بہ صد اصرار اپنی حویلی میں لے آئے تھے۔اس واقعے کو کئی برس گذر چکے تھے. یہاں تک کہ نورالعین نے انھی کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔

انا بی بے اولاد تھیں۔بھتیجے کی اولاد کی تربیت اور پیار میں اپنا خون جگر دے دیا۔

نورالعین حقہ گرم کر کے دالان میں لے آئی. انا بی کو میاں جی کے حقے سے سوتنا پا تھا۔

''جیتی رہیے! سلامت رہیے!'' میاں جی نے خوش ہو کر اسے دعاؤں سے نوازا۔

وہ ریڈیو سننے میں مصروف تھے۔معذوری کے باعث ان کے دو ہی مشاغل رہ گئے تھے۔ایک حقہ اور دوسرا ریڈیو۔ضعیفی کے باعث روزہ رکھنے سے مستثنیٰ تھے۔ریڈیو ان کے لیے حالات حاضرہ سے واقفیت کا ذریعہ تھا۔اس وقت بھی ان کے کان سے ریڈیو اور منہ سے حقے کی ناب لگی تھی۔

نورالعین کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ مسجد کے لیے افطاری چننے میں مصروف تھی۔مگر سماعت میاں جی کے ریڈیو پر ہی لگی تھی۔ جو گذشتہ ہفتے سے مسلسل دگرگوں حالات کا رونا پیٹ رہا تھا۔اور جنھیں سن سن کر نورالعین بانو کا چڑیا سا دل دہل جاتا تھا۔

''پرات تیار ہے بٹیا''؟ اصغری بوا نے اس کے پاس آ کر جھانکا تھا۔

''آداب بوا''! اس نے مسکرا کر تھال بوا کے حوالے کر دیا تھا۔

نو وارد نے بلند آواز سے ازن دخول چاہا تھا اور رسوئی سے قدم باہر نکالتی نورالعین کی دھڑکنیں ایک ساعت کو تیز ہوئی تھیں۔

''ارے شجاع میاں تسلیم تسلیم!'' اور شجاع علی خاں مع والدہ محترمہ ڈیوڑھی میں جلوہ افروز ہوئے تھے. جودت عباس ان کے استقبال کو آگے بڑھے.

سلیمہ جودت عباس کی نسبتی ہمشیرہ تھیں۔ بیوہ خاتون تھیں۔ان کے صاحبزادے شجاع علی خاں سے نورالعین کی نسبت طے پا چکی تھی۔ بظاہر وہ نورالعین کی عیدی دینے آئی تھیں لیکن رخصتی کی تاریخ لے کر ہی ٹلیں۔اس عید کے چاند تاریخ طے پا گئی۔

خالہ جان تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی تھیں اور شجاع! نورالعین نے غرفے کی جالیوں سے چھوٹی سی چوری کی تھی۔کیا مہتاب سی روشن پیشانی تھی اور کیا اس کی چمک! نورالعین آپ ہی آپ گلنار ہوئی تھی .مگر خوشیوں کی عمر بڑی مختصر تھی۔

بوا!! بوا!!! آدھی رات کو جب جھینگروں اور ٹڈیوں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ بڑے زور سے کسی نے حویلی کا صدر دروازہ پیٹا تھا۔

''ارے یہ تو شجاع میاں ہیں''۔ بوا کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ وہ آواز ہرگز بھی خوش گوار نہیں تھی۔

''ہم دیکھتے ہیں۔ بوا آپ اندر جایئے''

''جودت خاں پلنگ سے اٹھ آئے تھے''۔

چچا میاں!! زنجیر اترتے ہی شجاع علی نے جودت عباس کو بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ آواز سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

''کک کیا...ہوا شجاع!'' جودت خاں کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''کوئی نہیں بچا!! چچا میاں! اماں جان، بجو...سب....!''

''ہم مسجد میں تھے۔ جب پاکستان بننے کا اعلان سنا لیکن محلے میں پہنچے تو سب جل کر خاکستر ہو چکا تھا''۔ پھر جیسے خیال آیا۔

''جلدی کیجیے چچا میاں! وقت بالکل نہیں ہے! پورا دہلی اس وقت خون میں نہلا دیا گیا ہے''۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں شجاع''۔

شجاع کی باتوں میں ربط نہیں تھا۔

''کچھ مت پوچھیے چچا میاں! یوں سمجھیے کہ ہمارا واحد سرمایہ اس وقت مستورات ہیں۔ انھیں کسی طرح یہاں سے نکالنا ہے۔ جلدی کیجیے سوچنے کا وقت نہیں ہے''

شجاع کے لہجے میں عجلت، التجا، کرب، اندیشے، کیا کچھ نہیں تھا۔

وہ پوٹلی اٹھائے کانپ رہی تھی. جب انا بی اور بوا اس کے پاس آئی تھیں۔

''بوا! ہم میاں جی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے! آپ نورالعین کو لیجیے اور خدارا یہاں سے نکل چلیے''۔

''مم...مگر انا بی؟'' نورالعین کے لب کپکپائے تھے۔

''تمہارا اللہ حامی و ناصر!'' انا بی نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ اور بوا کے ساتھ اسے تاریک گلیوں میں دھکیل دیا تھا۔ شجاع، جودت خان اور ان کے دونوں بیٹے ڈیوڑھی تک ہی ان کی حفاظت کر پائے تھے۔ بلوائی کرپانیں اور خنجر لہراتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔

وہ بوا کے ساتھ اس خالی مکان میں دو دن سے پناہ گزین تھی۔

''نورالعین!'' بوا کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ خیالات سے چونکی. چلیے بٹیا سواری تیار ہے۔ کچھ لوگ ہمیں سرکاری کیمپ لے جا رہے ہیں۔ اور وہ سرخ جوڑا سینے سے لپٹائے رخصت ہو گئی تھی. آسمان پر عید کا چاند جگمگا یا تھا۔

افسانہ نگار: پنگ شِن ____ (چینی افسانہ)
مترجم: ڈاکٹر کوثر جمال، سڈنی، آسٹریلیا
تعاون: صدف اقبال۔ انڈیا

●

تعارفی نوٹ:
پنگ شن، گزشتہ صدی کے چین کے اول درجے کے ادیبوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا اصل نام شیئے وانگ اینگ تھا۔ قلمی نام انھوں نے پنگ شن اختیار کیا۔ اپنی طویل عمر میں پنگ شن نے بے شمار ناول، افسانے اور کہانیاں لکھیں۔ ''نوجوان قارئین کے نام خطوط'' ان کی ہلکی پھلکی تحریروں کا مقبول سلسلہ ہے جس کی بدولت انھیں چین اور بیرونی دنیا میں بچوں کی ادیبہ کے طور پر شہرت ملی۔ ان کی تحریریں چین، تائیوان اور ہانگ کانگ کے سکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ پنگ شن اپنی ابتدائی رومانوی تحریروں میں برِصغیر کے نوبل انعام یافتہ ادیب ٹیگور سے بھی متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریریں ندرتِ خیال، حسین تخیل اور رومانوی اسلوب کا شاہکار مانی جاتی ہیں۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں زندگی کے بڑے بڑے فلسفیانہ حقائق بیان کر دیتی ہیں۔ افسانہ ''علیحدگی'' میں بھی ایک نئی ٹیکنیک سے کام لیتے ہوئے زندگی کی اس تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے کہ انسان تو قبل از پیدائش ہی مختلف طبقوں میں بٹ چکے ہوتے ہیں۔ افسانے کی بنت اور اندازِ بیان نیند میں مسکراتے ہوئے بچّے کی طرح خوبصورت ہے۔

●●●

علیحدگی

کسی کے بہت بڑے ہاتھ نے مجھے درد کے اذیت ناک جال سے کھینچ کر باہر نکالا اور فضا میں میری پہلی چیخ بلند ہوئی۔ پھر کسی اور نے مجھے ہتھیلی پر اٹھا لیا اور سفید بستر پر دراز عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: مبارک ہو! بیٹا ہے۔''

پھر اس نے مجھے ایک چھوٹی سی ٹوکری میں جس پر سفید کپڑا بچھا ہوا تھا، لٹا دیا۔ سفید گاؤن اور ٹوپیاں پہنے تمام نرسیں عورت کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ زرد چہرے اور پسینے میں شرابور عورت نے طویل سانس لی جیسے خوفناک خواب سے جاگی ہو۔ اس کے سوجے ہوئے پپوٹے ادھ کھلے تھے۔ ڈاکٹر کی بات سن کر اس نے اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔

''شکریہ ڈاکٹر! آپ لوگوں کو میری وجہ سے بہت مشکل وقت دیکھنا پڑا''

میں نے یہ سن کر ایک بلند چیخ میں کہا: ''نہیں ماں، یہ تو ہم تھے جنھوں نے مشکل وقت دیکھا۔ ہم دونوں نے ابھی ابھی موت سے جنگ لڑی ہے۔''

ماں کو نرسوں کے ہجوم میں پہیوں والی کرسی پر کمرے سے باہر لایا گیا۔ مجھے بھی وہ لوگ کوریڈور میں لے آئے جس کی دوسری طرف ایک آدمی کھڑا تھا اور ایسا لگتا تھا وہ بھی بھیانک خواب سے جاگا ہو۔

ڈاکٹر کا اشارہ ملتے ہی وہ بھی ہمارے قریب چلا آیا۔اس نے میری طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں جیسے مجھے اٹھانا چاہتا ہو۔لیکن پھر خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔اس نے اپنا متفکر چہرہ مجھ پر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے پیار بھری حیرت جھلک رہی تھی۔

''اچھا ہے نا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا

''آں۔۔۔۔۔لیکن اس کا سر تو بہت لمبا ہے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اور مجھے اچانک جیسے اپنے سر کا درد یاد آ گیا۔میں زور سے رو پڑا:

''ابو! آپ کو کیا اندازہ کہ میرا سر کتنے تکلیف دہ طریقے سے نکالا گیا۔''

''اُف خدایا، کتنی تیز آواز ہے'' ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے مجھے ایک نرس کے حوالے کر دیا جو مسکرا رہی تھی۔ پھر مجھے ایک وسیع دھوپ دار کمرے میں لیجایا گیا۔دیوار کے ساتھ جھولوں کی قطار سی بنی ہوئی تھی اور ان سب میں بچے لیٹے ہوئے تھے۔کچھ آرام سے سو رہے تھے اور کچھ چیخ رہے تھے۔''میں بھوکا ہوں، مجھے گرمی لگ رہی ہے، میں گیلا ہو گیا ہوں''۔نرس جس نے مجھے اٹھا رکھا تھا، اس سارے شور شرابے سے لاتعلق سی لگ رہی تھی۔وہ مجھے کمرے سے ملحق غسل خانے میں لے گئی اور ایک پتھر کی میز پر لٹا دیا۔نیم گرم پانی کی دھاریں میرے جسم پر گریں اور مجھے کپکپی سی آئی۔لیکن ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔میں نے تھوڑا سا سر گھما کر ساتھ والی میز کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک بچّے کو نہلایا جا رہا تھا۔اس کا سر گول، آنکھیں بڑی بڑی، رنگت سیاہی مائل اور جسم مضبوط تھا۔وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر دیکھ رہا تھا۔غسل کے بعد ہم دونوں کو سفید گاؤن پہنا دیے گئے۔میری نرس نے اس کی نرس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''تمھارا بچہ کتنا بڑا، مضبوط اور توانا ہے۔لیکن میرے والا، خوبصورت اور نازک ہے۔''

'' کیسے ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہوں، شکریہ۔'' اُس نے دوستانہ جواب دیا۔ غسل کے بعد نرسوں نے ہمیں بھی دو پنگھوڑوں میں ساتھ ساتھ لٹا دیا اور خود چلی گئیں۔

''اُف میرا درد سے برا حال ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا ''مجھے اس دنیا میں آنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔آخری چار گھنٹے تو بہت ہی تکلیف دہ تھے۔''

''مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔بس یہی کوئی آدھ گھنٹہ۔اور نہ ہی میری ماں کو زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی۔'' وہ اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے مسکرایا۔میں اس کی بات سن کر خاموش رہا۔اس نے پھر کہا ''تم تھک چکے ہو، سو جاؤ، میں بھی یہی کرنے والا ہوں۔''

میں گہری نیند سو رہا تھا جب کوئی مجھے اٹھا کر شیشے کے دروازے کے پاس لے گیا۔دروازے کے اس طرف بہت سے لڑکے لڑکیاں تھے اور مجھے دیکھنے کے شوق اور تجسس میں انھوں نے اپنے ہاتھ

اور منہ اتنے زور سے شیشے کے ساتھ چپکا رکھے تھے کہ سب کی ناکیں چپٹی ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے ایسی متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے بچّے دکانوں میں رکھے ہوئے کھلونوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ میری طرف اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''اس کی بھنویں اپنی پھوپھو جیسی ہیں''۔

''اور ناک چچا کی طرح''۔ ''آنکھیں ماموں پر گئی ہیں''۔ ''منہ تو بالکل خالہ جیسا ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہوں۔ میں زور سے رو دیا۔

''نہیں، میں کسی جیسا نہیں ہوں۔ میں تو اپنے جیسا ہوں۔ مجھے سونے دو''

نرس مجھے روتا دیکھ کر مسکرانے لگی اور واپس پنگھوڑے میں لا کر لٹا دیا۔ اس وقت تک میرا پڑوسی بھی جاگ چکا تھا۔ اُس نے مجھے واپس آتے دیکھ کر پوچھا: ''کون آیا تھا تمھیں دیکھنے؟''

''پتہ نہیں، شاید میرے ماموں، چچا اور خالائیں۔ بہت سے لوگ تھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں انھیں پسند آیا ہوں۔''

وہ ایک لمحے تک خاموش رہا، پھر کہنے لگا: ''کتنا اچھا ہے۔ مجھے تو پیدا ہوئے دوسرا دن ہو گیا اور میں نے ابھی تک اپنا باپ بھی نہیں دیکھا۔''

میں شاید بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔ اب میری گردن اور کمر میں زیادہ درد نہیں تھا۔ لیکن میں گیلا ہو چکا تھا۔ باقی بچّوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی رونا شروع کر دیا: ''میں گیلا ہو گیا ہوں، گیلا، گیلا ہو چکا ہوں میں''۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی۔ ایک نرس آئی اور اس نے مجھے اٹھا لیا۔ میں بہت خوش ہوا۔ لیکن یہ کیا؟ اس نے مجھے تھوڑا سا پانی اور پلا دیا۔ شام کو تین چار نرسیں ہمارے کمرے میں آئیں۔ ان کے کلف لگے کپڑے سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی ہمارے لنگوٹ تبدیل کیے۔ کمرے کے تمام بچے اس تبدیلی سے بے حد خوش اور لطف اندوز ہوئے۔ ''ہم اپنی اپنی ماؤں سے ملنے جا رہے ہیں۔ خدا حافظ!''

میرے ننھے دوست سمیت بہت سے بچوں کو ایک بہت بڑے پہیوں والے بستر پر لٹا کر باہر لے جایا گیا۔ جبکہ مجھے ایک نرس نے اٹھایا اور کوریڈور سے ملحقہ کمروں میں سے ایک میں لے گئی۔ ماں ایک اونچے سے بیڈ پر دراز پرشوق نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں وہ کسی مجسمے کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ زرد جیسے اس میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ہلال ابرو۔ وہ بہت جوان دکھ رہی تھی۔ مجھے ماں کی گود میں لٹا دیا گیا اور میں ماں کا دودھ پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں بہت پیار سے میرے بالوں کو اپنی گال سے رگڑ رہی تھی۔ وہ شاید اس تکلیف دہ عمل سے گزر کر بہت کمزور ہو چکی تھی۔ میں باوجود کوشش کے ماں کے دودھ کا ایک قطرہ بھی حاصل نہ کر سکا۔ بھوک اور احساسِ ناکامی نے

مجھے تھکا دیا اور میں رونے لگا۔ ماں نے پیار سے کہا: ''میری جان، مت رو''۔ پھر اس نے گھنٹی بجائی جس کے ساتھ ہی ایک نرس کمرے میں آئی اور مجھے واپس لے گئی۔ واپس پنگوڑے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میرا دوست پہلے ہی واپس آ چکا تھا اور اپنے پنگوڑے میں مطمئن نیند سو رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی نیند میں مسکراتا تھا۔ پھر میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ میرے زیادہ تر روم میٹ گہری نیند سو رہے تھے۔ کچھ جاگتے ہوئے غوں غاں کر رہے تھے اور کچھ رو بھی رہے تھے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی اور میں حیران تھا کہ ماں کا دودھ جانے کب آئے۔ مجھے دراصل یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ حالانکہ اور کسی نے بھی اسے محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ احساس کہ دوسرے بچّے سیر شکم ہیں اور میٹھی نیند سو رہے ہیں، مجھے حسد اور شرم سے دوچار کر رہا تھا۔ میں نے اس امید میں زور زور سے رونا شروع کر دیا کہ شاید کوئی مجھے آ کر دیکھ لے۔ آدھ گھنٹے بعد کوئی نرس آئی اور مجھے تھپکیاں دینے لگی۔

''ہاں، سچ تو ہے، تم بھوکے ہو اور تمھاری امی نے تمھیں دودھ نہیں پلایا۔ چلو تھوڑا سا پانی پی لو۔''

اس نے پانی کی بوتل میرے منہ سے لگا دی۔ میں نے غٹا غٹ پانی پیا اور پھر شاید جلد ہی سو گیا۔

دوسرے روز غسل کے دوران میری اپنے دوست سے پھر باتیں ہوئیں۔ وہ آنکھیں بند کیے سر ہلا ہلا کر غسل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''کل میں نے خوب دودھ پیا'' اس نے خوشی سے کہا، ''میری ماں کا سانولا سا گول چہرہ ہے اور وہ بہت خوبصورت ہے۔ میں اس کا پانچواں بچّہ ہوں۔ ایک خیراتی ادارے نے اس کے ہسپتال کے اخراجات پورے کیے ہیں۔ میرا باپ ایک غریب آدمی ہے۔ وہ قصاب ہے۔''

اس وقت نرس نے بورک ایسڈ کے کچھ قطرے اس کی آنکھوں میں ڈالے۔ اس نے ناپسندیدگی سے کچھ چیخیں ماریں، آنکھیں بھینچ بھینچ کر صاف کیں اور پھر باتیں کرنے لگا۔ ''جانوروں کو ذبح کرنا کتنا خوفناک ہوتا ہے۔ ایک چمکتی ہوئی چھری ان کے جسم کے اندر جاتی ہے اور پھر باہر آ جاتی ہے، خون کے قطروں کے ساتھ۔''

میں اس کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ لیکن اس آخری بات نے مجھے خوفزدہ کر دیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پھر کہا:

''اور تمھارا کیا حال ہے؟ کل تم نے دودھ پیا؟ اور تمھاری ماں کیسی ہے؟''

میں نے کہا: ''کل مجھے پینے کو کچھ نہیں ملا۔ ماں کا تو ابھی دودھ ہی نہیں آیا۔ نرس کہتی ہے کچھ دنوں میں آ جائے گا۔ میری ماں بہت اچھی ہے۔ وہ پڑھ بھی سکتی ہے۔ اس کے بستر کے ساتھ والی شیلف پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کمرے میں پھول ہی پھول تھے۔'' ''اور تمھارا باپ؟''

''وہ وہاں نہیں تھا۔ ماں بس اکیلی تھی اور کسی سے بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ اپنے باپ کے بارے میں ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''وہ پھر فرسٹ کلاس وارڈ میں ہے۔'' میرے دوست نے کہا۔ ''وہاں کمرے میں صرف ایک بیڈ ہوتا ہے۔ میری ماں کے وارڈ میں تو کوئی درجن بھر بیڈ تھے۔ ہمارے اس کمرے کے بہت سے بچوں کی مائیں اسی وارڈ میں ہیں۔ اور ان سب بچوں نے میری طرح خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا۔''

دوسرے روز جب مجھے دودھ پینے کے لیے لے جایا گیا تو میں نے اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ میری ماں کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے ماں باپ کے چہرے پریشان تھے اور وہ متفکر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے باپ کا چہرہ پتلا، پلکیں لمبی اور آنکھیں مہربان ہیں۔ وہ اپنی بھنویں سکوڑے رکھتا ہے جیسے ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں گم ہو۔

''اب میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ یہ تو تمھاری طرح خوبصورت ہے۔'' میرے باپ نے مجھے دیکھ کر میری ماں سے کہا۔

''اور اس کی آنکھیں تمھاری طرح بڑی بڑی ہیں۔'' ماں میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے مسکرائی۔ میرے باپ نے محبت سے ماں کے کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا:

''اب ہم اکیلے نہیں رہے۔ میں اس کی دیکھ بھال میں تمھاری مدد کروں گا۔ اور اپنے سکول ٹائم کے بعد اس سے کھیلا کروں گا۔ ہم چھٹی کے دن اسے پہاڑ یا ساحلِ سمندر پر لے جایا کریں گے۔ ہمیں اس کی صحت کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ اسے میری طرح کمزور نہیں رہنا چاہیے۔''

ماں نے اثبات میں سر ہلایا: ''ہاں! اسے موسیقی اور مصوری بھی سیکھنی چاہیے۔ مجھے یہ دونوں فنون نہیں آتے اور مجھے لگتا ہے جیسے زندگی ان کے بغیر مکمل نہیں۔''

''تم کیا چاہتی ہو، یہ بڑا ہو کر کیا بنے، ادیب یا موسیقار؟''

''جو بھی یہ پسند کرے گا۔ ابھی تو بہرحال یہ بچہ ہے۔ لیکن چین کو سائنس کی ضرورت ہے۔ شاید اس کے لیے سائنسدان بننا زیادہ بہتر ہوگا۔''

مجھے آج بھی دودھ نہیں ملا تھا۔ لیکن اپنے ماں باپ کی دلچسپ باتوں نے مجھے رونے سے باز رکھا۔

''ہمیں آج ہی اس کی تعلیم کے لیے بچت شروع کر دینی چاہیے۔ جتنا جلدی کریں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

میری ماں نے اچانک کہا: ''ارے ہاں میں تمھیں بتانا تو بھول ہی گئی، میرے بھائی نے کہا ہے کہ جب یہ چھے سال کا ہو جائے گا تو وہ اسے سائیکل لے کر دے گا۔''

''ہمارے بیٹے کو سب کچھ ملے گا، میری بہن بھی تو اسے جھولا خرید کر دے گی۔'' میرے باپ نے فخر سے کہا۔

ماں میرے سر کا بوسہ لیتے ہوئی بولی: ''بیٹے، کیا یہ اچھا نہیں کہ اتنے سارے لوگ تم سے پیار کرتے ہیں۔ بڑا ہو کر اچھا لڑکا بننا!''۔ میں بہت خوشگوار موڈ میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ حالانکہ آج بھی میں بھوکا تھا۔ البتہ میرا دوست آج کچھ فکر مند لگ رہا تھا۔ میں نے اس کو بتایا: ''سنو! آج میں نے اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ ایک سکول ٹیچر ہے۔ وہ میری ماں کے ساتھ میری آئندہ تعلیم کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے اچھے مستقبل کے لیے بہترین کوششیں کرے گا۔ ماں نے کہا ہے کہ اگر اس کا دودھ نہ آیا تو تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ جب میں گھر واپس جاؤں گا تو مجھے گائے کا دودھ پینے کو مل جایا کرے گا۔ اور اس کے بعد فروٹ جوس اور بہت ساری دوسری اچھی چیزیں۔'' میں نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہ ڈالیں۔

''کتنے خوش قسمت ہو تم''۔ وہ مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ میں رحم یا حقارت کا جذبہ بھی تھا۔ ''جب میں گھر جاؤں گا تو مجھے ماں کا دودھ بھی پینے کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ میری ماں کسی امیر گھر میں ''دودھ ماں'' کا کام کرنے لگے گی۔ یہ میں نے آج اپنے باپ سے سنا۔ پھر میری دادی میری پرورش کرے گی۔ وہ اب ساٹھ سال کی ہے۔ وہ مجھے چاول کا پتلا دلیہ اور سویا بین پاؤڈر کھانے کو دے گی۔ خیر! مجھے کوئی پروا نہیں۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی حقارت آمیز مسکراہٹ سے میرے اندر جو شکایت پیدا ہوئی تھی اس کی جگہ شرمندگی نے لے لی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ اب اس کی آنکھوں میں غرور اور ہمت کی چمک تھی۔

''تم ہمیشہ ایک ہرے بھرے گھر میں گملے کے پودے کی طرح رہو گے۔ ہواؤں، بارشوں اور بدلتے موسموں کی دھوپ سے محفوظ۔ اور میں سڑک کے کنارے اگی ہوئی اس گھاس کی طرح جسے انسان اور جانور اپنے قدموں تلے کچلتے رہتے ہیں اور جو آندھیوں اور بارشوں کے تھپیڑے سہتی ہے۔ تم شاید اپنے ہرے بھرے گھر کی کھڑکی میں سے مجھے دیکھو گے اور مجھ پر ترس کھاؤ گے۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے سر پر ایک وسیع آسمان ہو گا اور تازہ ہوا۔ تتلیاں اور بھنورے میرے لیے گیت گایا اور رقص کیا کریں گے اور پھر میرے ساتھ اور بھی بہت سے ایسے خاکسار ہوں گے جو گھاس کی کٹائی اور آتش زدگی سے بچ رہیں گے اور پھر ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ دنیا کو اپنی ہریالی سے سجا دیں گے۔''

اس کی باتوں نے مجھے رو دینے کی حد تک شرمندہ کر دیا۔ ''میں نے خود تو ایسی نفیس و نازک زندگی کا انتخاب نہیں کیا۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

میری ناخوشی کو محسوس کرتے ہوئے اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''سچ ہے۔ ہم

میں سے کوئی بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہونا نہیں چاہتا۔لیکن ہماری ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز ایک کو دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔چلو دیکھتے ہیں کہ آنے والا وقت ہم دونوں کے لیے کیسا ہوگا۔“
کھڑکی سے باہر روئی کے سفید گالوں جیسی برف نے چھتوں کی سبز اینٹوں پر ڈھیر لگا دیے تھے۔میں اور ماں نئے سال سے پہلے پہلے گھر جانے والے تھے۔اور اسی طرح میرا دوست اور اس کی ماں بھی۔ کیونکہ اس کی ماں کو نوروز سے پہلے اپنی نوکری شروع کرنا تھی۔اب ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے بس آدھا دن ہی باقی تھا۔پھر اس کے بعد ہم دونوں کو انسانوں کے سمندر میں کھو جانا تھا۔کیا پھر کبھی ایسا وقت آئے گا جب ہم دونوں اس طرح ایک چھت تلے سو پائیں گے؟
ہم نے ایک دوسرے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے سے پختہ عزم عیاں تھا۔بھنویں سکوڑے ہوئے آنکھوں کے بیچ قدرے زیادہ فاصلہ،ٹھوڑی کچھ دبی ہوئی،اس کا چہرہ شام کی روشنی میں کسی قدر دھندلا سا گیا تھا۔
شام کو اپنی ماؤں کے پاس سے واپس آنے کے بعد ہمارے بیچ پھر گفتگو ہوئی۔آج شام ہماری روانگی کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا اور اب ہم نے کل صبح یہاں سے رخصت ہونا تھا۔دراصل میرے باپ نے سوچا تھا کہ نوروز کی شام گھر میں مہمانوں کا جمگھٹا ہوگا اور اس شور و ہنگامے سے میری ماں تھک جائے گی۔اور میرے دوست کے باپ کو آج شام قرض خواہوں سے بچنے کے لیے گھر سے باہر رہنا تھا۔رواج کے مطابق لوگ نئے سال کی آمد سے پہلے پہلے اپنے حساب کتاب صاف کرتے ہیں۔اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کی بیوی کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھانا پڑے۔
آج نصف شب تک ہر جگہ پٹاخے چلنے کا لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔شدید برفباری میں گاہے گاہے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ ایک اور برس اپنے دامن میں محبتیں اور نفرتیں لیے اپنے معمولی انجام تک پہنچنے والا ہے۔کل صبح اپنے چہروں پر پھر سے شرافت اور خوشیوں کے ماسک چڑھانے سے پہلے لوگ آج رات کھاتے پیتے ہیں،شکایتیں کرتے،برا بھلا کہتے اور رو دھو کر جی ہلکا کر لیتے ہیں۔اس شہر کی اداس گلیوں اور سڑکوں پر نہ جانے کتنے جذبوں کی دھڑکنیں پٹاخوں کی بھک بھک کے شور میں دب گئی تھیں۔
صبح صبح دو نرسیں جن کے چہرے صبحِ نوروز کی مسرتوں سے دمک رہے تھے،ہمیں نہلانے کے لیے آئیں۔ان میں سے ایک نے مجھے فلالین کا نیکر،مٹروں کے رنگ کا ہلکا سبز سوئٹر،اسی رنگ کی ٹوپی اور موزے پہنائے۔یہ کپڑے اس نے چھوٹے سے سوٹ کیس میں سے نکالے تھے۔مجھے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے بغور دیکھا اور کہا:”واہ!بڑے خوبصورت لگ رہے ہو۔تمھاری امی کو تمھیں سمارٹ بنانا آتا ہے۔“۔کپڑے گرم اور نرم تھے لیکن مجھے یہ کپڑے پہن کر سخت گرمی لگنے

لگی۔ بے چینی کے احساس سے میں نے رونا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا دوست بھی نرس کے ہاتھوں میں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ اسے تو پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اسے کمر سے نیچے نیلے رنگ کے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ اور اوپر نیلے رنگ کی روئی بھری صدری پہنائی گئی تھی جس کے بازو اتنے لمبے اور سخت تھے کہ میرے دوست کی بانہیں کسی پتنگ کی طرح اکڑ گئی تھیں۔ ابھی جو سفید لبادے ہم دونوں نے اتارے تھے انھیں دیکھتے ہوئے مجھے جھرجھری سی آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مادی اور ذہنی دونوں اعتبار سے۔

میرا دوست میری نظریں پڑھ کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فخر اور خفت کا ملا جلا احساس تھا۔ اس نے کہا: ''تم اپنے خوبصورت کپڑوں میں اچھے لگ رہے ہو اور میں نے اپنی زرّہ بکتر پہن لی ہے تاکہ کارزارِ حیات میں زندگی کی جنگ لڑ سکوں۔''

نرسوں نے ہمارے استعمال شدہ لبادے لانڈری باسکٹ میں پھینک دیے۔ اور ہمیں اٹھائے ہوئے تیزی سے باہر آ گئیں۔ جب ہم دونوں شیشے کے دروازے کے پاس پہنچے تو میں اپنے رونے پر قابو نہ پا سکا اور میرا دوست بھی اپنے آنسو روک نہ سکا۔ ہم دونوں نے پرجوش طریقے سے اپنے بازو ہلائے اور چلا کر کہا: ''خدا حافظ۔۔۔۔ پیارے دوست!''

ہم اپنی جدا جدا راہوں پر چل دیے۔ ہمارے رونے کی آواز کوریڈور کے مخالف کناروں کی طرف جاتے ہوئے ڈوبتی چلی گئی۔

ماں کمرے میں تیار کھڑی تھی، اس کے قریب ہی میرا باپ سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔ ماں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر میرے آنسو پونچھے اور نرمی سے کہا: ''مت رو میرے چاند، ہم گھر جا رہے ہیں۔ تمھاری امی کو تم سے بہت پیار ہے اور تمھارے ابّا کو بھی''۔

پہیوں والی کرسی لائی گئی۔ ماں اس میں بیٹھ گئی، اپنے بازوؤں میں مجھے اٹھائے ہوئے، اس نے ہلکے سبز رنگ کا کمبل اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ ابّو ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر اور نرسیں جو ہمیں خدا حافظ کہنے آئے تھے ان سے رخصت ہو کر ہم لفٹ کے ذریعے نیچے آئے۔ ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے ہی کار کھڑی تھی۔ ابو نے جونہی دروازہ کھولا، برف کا ایک گالا کار کے اندر چلا گیا۔ ماں نے فوراً میرا چہرہ کمبل سے ڈھانپ دیا۔ ہم کرسی سے اتر کر کار میں بیٹھ گئے اور کار کے دروازے زور سے بند کر لیے۔ ماں نے میرے چہرے پر سے کمبل اٹھایا اور میں نے اپنے چاروں طرف پھولوں کو اور اپنے والدین کے محبت بھرے چہروں کو دیکھا۔ ہسپتال کے گیٹ کے سامنے کی سڑک پر رکشاؤں کی بھیڑ کی وجہ سے ٹریفک جام ہو چکی تھی۔

ہم راستہ صاف ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی دوران میں نے کار کے شیشے سے باہر دیکھا اور

میری نظر اپنے دوست پر پڑی جسے اس کے باپ نے اٹھا رکھا تھا۔ ان کے پیچھے اس کی ماں تھی جس نے ہاتھوں میں نیلی سی گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ اس کے باپ نے نمدے کی ٹوپی اور روئی بھرا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ننھے سے بیٹے نے اپنا سر اپنے باپ کے مضبوط کاندھوں پر ٹکایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دوست کا چہرہ دیکھا۔ باپ کی ٹوپی کے سائے کے باوجود، برف کے ننھے ننھے ذرے اس کی بھنوؤں اور گالوں پر دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کی ہوئی تھیں لیکن اس کے ہونٹوں پر مدھم سی فخریہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ہسپتال چھوڑتے ہی اپنی جنگ کا آغاز کر چکا تھا۔

ہماری کار اڑتی ہوئی برف اور جشنِ نوروز کے ڈرموں اور باجوں کے شور کو کاٹتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ماں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے سرگوشی کی: ''دیکھو میری جان، ہماری دنیا کتنی ہموار اور صاف ستھری ہے!''

میں بے اختیار رونے لگا۔

قیصر نذیر خاور

کافکا کے افسانچے

کافکا (پورا نام: Franz Kafka؛ 3 جولائی 1883ء کو پراگ میں پیدا ہوا، جو اس وقت سلطنت بوہمیا کا دارالسلطنت تھا۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ یہودی ادیب ایک پیچیدہ سماجی پچھوکڑ رکھتا ہے اور اس کے زمانے، جس میں یورپی بادشاہتیں ٹوٹ رہی تھیں اور صنعتی انقلاب اپنا راستہ ہموار کر رہا تھا، ان کا عکس اس کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ ایسے میں اس کے کردار فردی تجربے کی عمدہ مثال ہیں جو وجودیت پسند ہیں، انتشار اور لایعنیت اور تنہائی کا شکار ہیں جو ایسے متغیر دور کا خاصہ ہوتا ہے۔ اس کے ناول 'قلعہ' (Das Schloss)، 'میٹامورفسس' (Die Verwandlung) اور 'آزمائش' (Der Process) اس کی پہچان ہیں۔ وہ فلیش فکشن لکھنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ تپِ دق کا شکار کافکا 40 سال کی عمر میں 3 جون 1924ء کو فوت ہوا۔ اس کا زیادہ تر کام اس کی موت کے بعد شائع ہوا۔ اس کی لکھتوں کا اثر عالمی ادب پر بہت واضح طور پر پڑا یہاں تک کہ اصطلاح ''کافکیت'' (Kafkaesque) اب ادب کا لازمی جزو ہے۔

.....

ایک سپنا (۱)

جوزف 'کے' سپنا دیکھ رہا تھا: یہ ایک خوشگوار دن تھا چنانچہ 'کے' کا دل کیا کہ وہ سیر کو نکلے۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اس نے خود کو ایک قبرستان میں پایا۔ اس کے راستے اتنے بھدے طریقے سے ان گنت موڑوں کے ساتھ بنائے گئے تھے کہ ان پر چلنا ناممکنات میں سے تھا، پھر بھی وہ ان میں سے ایک راہداری پر کچھ ایسے پھسلتا چلا گیا جیسے بنا ڈولے بپھرے پانیوں پر اڑے جا رہا ہو۔ اس نے دور سے ہی اس تازہ کھدی قبر کے پاس مٹی کے ڈھیر کو دیکھ لیا تھا جہاں وہ رکنا چاہتا تھا۔ اس ڈھیر نے اسے مسحور تو کر رکھا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ وہاں جلد پہنچ نہ پائے گا۔ وہ ڈھیر اسے نظر آتا رہا جو ان جھنڈوں سے ملفوف تھا جو ایک دوسرے سے الجھے زور سے پھڑ پھڑا رہے تھے؛ گو جھنڈے بردار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہاں شادمانی کا اظہار کیا جا رہا ہو۔
گو اس کی آنکھیں ابھی بھی دور فاصلے پر گڑی تھیں کہ اس نے دیکھا کہ ڈھیر اچانک اس کی راہ کے ساتھ آ گیا ہے، سچ مچ تقریباً اس کے پچھلی طرف ہی۔ چونکہ راہداری اس کے پیروں تلے پھسلے جا رہی تھی، اس نے جیسے ہی اچک کر آگے بڑھنا چاہا، وہ ڈگمگایا اور بالکل ڈھیر کے سامنے گھٹنوں کے

بل گر پڑا۔ قبر کے پیچھے دو آدمی ہوا میں معلق پتھریلا کتبہ لیے کھڑے تھے؛ جیسے ہی انہیں ’کے‘ نظر آیا، انہوں نے پتھر زمین میں گاڑ دیا جو ایسے ایستادہ ہو گیا جیسے وہ زمین کا ہی حصہ ہو۔ یک لخت جھاڑیوں سے ایک تیسرا شخص نکلا جسے ’کے‘ نے فوراً پہچان لیا، وہ ایک مصور تھا۔ اس نے صرف پتلون اور بٹنوں کے بغیر قمیض پہن رکھی تھی؛ اس کے سر پر ایک مخملیں ٹوپی تھی؛ اس کے ہاتھ میں ایک عام سی پنسل تھی جس سے وہ ہوا میں اشکال بناتا آ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی پنسل کی نوک کو پتھر کے اوپر لے کنارے کے پاس لگایا؛ پتھر اتنا اونچا تھا کہ اسے بہت زیادہ جھکنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی، وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا کیونکہ وہ قبر کی مٹی کے اس ڈھیر پر پاؤں دھرنا نہیں چاہتا تھا جو پتھر اور اس کے درمیان حائل تھا چنانچہ اس نے خود کو اپنے پنجوں پر جمایا اور بائیں ہاتھ سے پتھر کی سطح کا سہارا لیا۔ پھر وہ اپنی عمدہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سادہ سی پنسل سے سنہرے الفاظ بنانے میں کامیاب ہو گیا؛ اس نے لکھا: ’’یہاں دفن ہے۔۔۔۔۔‘‘، ہر حرف انتہائی صفائی اور خوبصورتی سے گہرائی سے خالص سونے سے کھدا ہوا تھا۔ ان دو الفاظ کو لکھ کر اس نے ’کے‘ کی طرف مڑ کر دیکھا؛ ’کے‘، جو یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا کہ آگے وہ کیا کندہ کرتا ہے، پتھر کو گھورتا رہا اور آدمی پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اصل میں وہ آگے لکھنا تو چاہتا تھا لیکن لکھ نہیں پا رہا تھا، کچھ ایسا تھا جو اس کا ہاتھ روکے ہوئے تھا، اس نے اپنی پنسل کو نیچے کیا اور ایک بار پھر ’کے‘ کی طرف مڑا۔ اس بار ’کے‘ نے بھی فنکار کی طرف نگاہ کی جسے دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ خجالت کا شکار ہے لیکن اپنی پشیمانی کی وضاحت نہیں کر پا رہا۔ وہ اپنی پہلی سی تیزی کھو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ’کے‘ کو بھی شرمندگی کا احساس ہوا؛ ان کے درمیان بیچارگی بھری نظروں کا تبادلہ ہوا؛ ان کے درمیان کوئی غلط فہمی تھی جس کو ان میں سے کوئی ایک بھی دور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس معاملے کو، گھنٹی کی آواز نے نامناسب طور پر گرجے سے ابھر کر، اور گمبھیر کر دیا لیکن فنکار نے اپنا ہاتھ اٹھا کر تیزی سے اس طرح ہلایا کہ گھنٹی کی آواز آنا بند ہو گئی البتہ کچھ ہی وقفے کے بعد یہ پھر آنے لگی؛ اس بار یہ مدھم تھی اور جلد ہی پھر سے بند ہو گئی گو کہ فنکار نے کوئی تنبیہی اشارہ نہیں کیا تھا؛ لگتا تھا کہ یہ آواز کی جانچ کے لیے بجائی گئی تھی۔ ’کے‘ کو مصور کے تذبذب پر دکھ ہوا اور وہ کافی دیر منہ ہاتھوں میں دیئے روتا رہا۔ فنکار پہلے تو ’کے‘ کے چپ ہونے کا منتظر رہا لیکن پھر کوئی اور راستہ نہ پا کر اس نے اپنے لکھنے کے عمل کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ’کے‘ لکھنے کے لیے پنسل کو پتھر پر دبایا لیکن وہ یہ بہت ہچکچاہٹ سے کر رہا تھا؛ اور اس کی لکھائی میں پہلے والی خوبصورتی بھی نہ تھی۔۔۔۔ اس سے بڑھ کر یہ سنہری پن سے بھی خالی تھی، پنسل پیلاہٹ اور ناہمواری کے ساتھ لکھتی چلی گئی، سوائے اس کے، کہ الفاظ بہت بڑے تھے۔ یہ اے جے تھا،

تقریباً مکمل؛ اس پر فنکار نے غصے سے مٹی کے ڈھیر میں اپنا پاؤں زور سے مارا جس سے سیاہی مائل مٹی اچھل کر ہوا میں پھیل گئی۔ اب ’کے‘ کو اس کی سمجھ آئی؛ لیکن معافی مانگنے کا وقت ہی نہ بچا تھا؛ اس نے اپنی انگلیوں سے زمین کھودی، جس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی؛ لگتا تھا کہ سب کچھ پہلے سے ہی تیار تھا؛ مٹی کی ایک باریک سی تہہ ہی دکھاوے کے لیے وہاں موجود تھی؛ جس کے نیچے ایک بڑا اگڑھا منہ کھولے موجود تھا، اور ’کے‘ نے آہستگی سے اپنا رخ پلٹا یا اور گڑھے میں لیٹ گیا۔ اس کی گہرائی نے اسے خوش آمدید کہا لیکن چونکہ اس کا سر اس کی گردن پر اوپر کی طرف تھا لہٰذا وہاں اسے اپنا نام عمدہ سجاوٹ کے ساتھ پتھر پر لکھا دکھائی دے رہا تھا۔

اپنے نام کے اسی نظارے کی سرمستی میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

جاگیردار کے گھر پہ دستک (۲)

یہ گرمیوں کا ایک گرم دن تھا۔ میں اپنی بہن کے ہمراہ اپنے گھر جاتے ہوئے اس بڑے گھر کے دروازے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں صحیح طور پر تو نہیں بتا سکتا کہ اس نے شرارتاً دروازے پر دستک دی تھی یا بے دھیانی میں وہ ایسا کر بیٹھی تھی یا پھر شاید اس نے ہاتھ کو اس طرح لہرایا ہو کہ مجھے لگا ہو کہ اس نے دستک دی جبکہ اس نے ایسا کچھ کیا ہی نہ ہو۔ سڑک کوئی سو قدم آگے جا کر بائیں طرف مڑتی تھی جہاں سے گاؤں شروع ہوتا تھا۔ ہم اس سے کچھ زیادہ واقف نہ تھے لیکن جیسے ہی ہم اس کے پہلے مکان کے پاس سے گزرے تو لوگ نظر آنے لگے جو ہمیں دوستانہ یا شاید انتباہی اشارے کر رہے تھے؛ وہ خود بھی دہشت سے مضمحل اور خوفزدہ سے لگ رہے تھے۔ انہوں نے جاگیردار کے اس گھر کی طرف اشارہ کیا جس کے پاس سے ہم گزر کر آئے تھے اور انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہم نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ حویلی کا مالک اب ہمیں موردالزام ٹھہرائے گا اور فوری طور پر پوچھ گچھ شروع کر دے گا۔ میں خاموش اور پرسکون رہا اور اپنی بہن کے خوف کو بھی شانت رکھنے کی کوشش کی۔ غالباً اس نے دروازے کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہوا اور اگر اس نے ایسا کیا بھی تھا تو اس کو ثابت کیسے کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے اردگرد اکٹھے ہوئے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری بات سننے کے باوجود اس پر اپنی خیال آرائی سے گریز کیا۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ نہ صرف میری بہن بلکہ میں، اس کا بھائی ہونے کے ناطے، بھی قصوروار ٹھہرایا جاؤں گا۔ میں نے سر ہلایا اور مسکرایا۔ ہم سب نے حویلی کو اس نظر سے گھورا جس طرح بندہ دور سے آتے دھویں کے بادل کو دیکھتا ہے اور شعلوں کے آنے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اسی سمے ہم نے کھلے دروازے میں گھڑسواروں کو داخل ہوتے دیکھا۔ گرد اڑی جس نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا، صرف ان کے لمبے نیزوں کی انیاں تھیں جو چمک رہی تھیں۔ حویلی کے صحن

میں داخل ہونے کے بعد وہ بمشکل ہماری نظروں سے اوجھل ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو واپس موڑا اور اب ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نے اپنی بہن کو کہا کہ وہ مجھ سے الگ ہو جائے کہ میں خود ہی معاملہ سنبھال لوں گا، لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کم سے کم اپنا حلیہ تو بدل لے تا کہ ان گھڑ سواروں کے سامنے بہتر کپڑوں میں نظر آئے۔ بالآخر اس نے میری بات مان لی اور اس لمبی سڑک پر چل دی جو ہمارے گھر کو جاتی تھی۔ جلد ہی گھڑ سوار ہمارے سر پر تھے۔ ابھی وہ گھوڑوں سے اترے بھی نہ تھے کہ انہوں نے میری بہن کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ تو ابھی یہاں نہیں ہے۔''، میں نے تشویش بھرے لہجے میں جواب دیا، ''لیکن وہ بعد میں آ جائے گی۔''، میرا جواب انہیں بے معنی لگا؛ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے لیے یہ اہم تھا کہ انہوں نے مجھے قابو کر لیا تھا۔ اس جتھے میں دو آدمی سر کردہ تھے: ایک جو منصف لگتا تھا، زندہ دل نوجوان تھا جبکہ دوسرا اس کا خاموش طبع نائب جس کا نام 'اسمان' تھا۔ مجھے ایک دیہاتی ڈیرے میں جانے کو کہا گیا۔ میں نے سر ہلایا اور پتلون کے 'گیلس' کندھے پر ٹھیک کرتا آہستہ آہستہ بولنا شروع ہوا جبکہ جتھے کے لوگوں کی نظریں مجھ پر تفتیشی انداز میں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ابھی بھی یقین تھا کہ مجھ جیسے شہری آدمی کے منہ سے نکلے عزت والے الفاظ میری رہائی کے لیے کافی ہوں گے۔ جیسے ہی میں نے ڈیرے کی دہلیز پار کی تو منصف، جو تیزی سے مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا، سامنے کھڑا میرا منتظر تھا۔ وہ بولا: ''میں اس شخص کے بارے میں سچ مچ رنجیدہ ہوں۔'' یہ سن کر مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ یہ شخص میری موجودہ حالت کے بارے میں بات نہیں کر رہا بلکہ کچھ اس بارے میں کہہ رہا ہے جو میرے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ مجھے ڈیرے کا کمرہ عقوبت خانے کی ایک کوٹھڑی لگنے لگا جس کا فرش بڑے بڑے پتھروں کا بنا ہو، جس کی ننگی دیواریں سیاہ ہوں اور جن میں سے ایک کے درمیان لوہے کا کڑا اگڑا ہو اور کمرے کے بیچوں بیچ کچھ ایسا بچھا ہو جیسے کوئی گدا یا پھر آپریشن کرنے والی میز۔

کیا اب مجھے زندان کی ہوا کے علاوہ کوئی اور ہوا مل پائے گی؟ یہ وہ بڑا سوال ہے، یا پھر یہ کہ میری رہائی کے کچھ امکانات ابھی بھی باقی ہیں۔

درِ قانون (۳)

درِ قانون ایک دربان بیٹھا ہے۔ اس کے پاس ایک شہری آ کر اس سے اندر جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ دربان اسے کہتا ہے کہ وہ اس وقت تو اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بندہ کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ کیا یہ بعد میں کسی وقت ممکن ہو گا؟

''ہاں یہ ممکن ہے۔'' دربان جواب دیتا ہے۔ ''لیکن ابھی نہیں۔''
قانون کا دروازہ کھلا ہے، جیسا کہ ہر وقت ہی رہتا ہے۔ جیسے ہی دربان تھوڑا سا ایک طرف کو ہوتا ہے تو آدمی اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ دربان اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر ہنستا ہے اور کہتا ہے: ''اگر یہ تمہیں اتنا ہی لبھا رہا ہے تو میرے منع کرنے کے باوجود اندر جانے کی کوشش کر دیکھو۔ لیکن یاد رکھو، میں سب سے ادنیٰ دربان ہونے کے باوجود اتنا طاقتور ہوں کہ تمہیں روک سکوں جبکہ اندر تو ہر کمرے کے باہر ایک سے بڑھ کر ایک طاقتور دربان کھڑا ہے۔ میں تو تیسرے کی ایک جھلک بھی برداشت نہیں کر پاتا۔''
شہری ان مشکلات کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا، اس کا خیال تھا کہ قانون تک تو رسائی ہر بندے کو ہونی چاہیے۔ اس نے دربان پر ایک قریبی نظر ڈالی؛ اس کے سموری کوٹ، اس کی بڑی نوکیلی ناک، لمبی، پتلی اور کالی تاتاری داڑھی دیکھ کر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے اس وقت تک انتظار ہی کرنا چاہیے جب تک اسے اندر جانے کی اجازت نہ مل جائے۔
دربان اسے ایک موڑھا دیتا ہے تا کہ وہ دروازے کے سامنے ایک طرف بیٹھ کر انتظار کر سکے۔ وہ وہاں دِنوں بلکہ سالوں تک بیٹھا رہتا ہے۔ وہ اندر جانے کی کوشش میں دربان سے بار بار اندر جانے کی درخواست کرتا ہے۔ دربان اس سے اس کے علاقے اور دیگر کئی چیزوں کے بارے میں پوچھتا ہے، لیکن یہ سب سوال غیر متعلقہ سے ہوتے ہیں، ویسے ہی جیسے بڑے لوگ صرف 'بات برائے بات' کے لیے کرتے ہیں اور ہر بار وہ آخر میں اسے کہ دیتا ہے کہ وہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آدمی جو زادِ راہ کے طور پر بہت سی اشیاء ساتھ لے کر آیا تھا، ایک ایک کر کے سب دربان کو دے دیتا ہے جن میں سے کئی قیمتی بھی ہیں، کہ اس کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ دربان یہ سب لیتا جاتا ہے اور کہتا ہے: ''وہ یہ سب اس لیے قبول کر رہا ہے کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ اس نے اندر جانے کی اجازت کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔''
کئی سالوں سے اسی ایک دربان کو دیکھتے دیکھتے وہ دیگر دربانوں کے بارے میں بھول جاتا ہے اور اسے یہی دربان اپنے قانون تک پہنچنے اور اپنے راستے کی واحد رکاوٹ لگنے لگتا ہے۔ شروع کے چند سالوں میں وہ اپنے بدقسمت حالات پر کڑھتا ہے اور بے دھیانی میں اس پر شور بھی مچاتا ہے۔ وہ بعد میں بوڑھا ہونے پر بھی ایسا کرتا ہے لیکن اب اس کی اونچی آواز بڑبڑاہٹ میں بدل گئی ہوتی ہے۔ اب وہ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں میں اس نے یہ مشاہدہ بھی کیا ہوتا ہے کہ دربان کے سموری کوٹ کے 'کالر' میں پسوؤں نے گھر کر لیا ہوا ہے۔ وہ ان پسوؤں سے بھی مدد مانگتا ہے کہ وہ دربان کو راضی کرنے میں اس کی اعانت کریں۔ بالآخر اس کی نظر اتنی کمزور پڑ جاتی

ہے کہ اسے یہ جانکاری ہی نہیں ہوتی کہ اس کے اردگرد کی اشیاء سچ میں گہرے رنگ کی ہیں یا یہ اس کی نظر کا دھوکہ ہے، البتہ اب اسے 'اَندھراتے' میں بھی قانون تک پہنچنے والی گزرگاہ سے پھوٹتی روشنی دکھائی دیتی رہتی ہے۔اب اس کی زیست کا انت قریب ہے۔اپنی موت سے پہلے وہ اپنے دماغ میں اپنے بیتے وقت کے سارے تجربات ایک ایسے سوال میں مجتمع کرتا ہے جو اس نے دربان سے نہیں پوچھا ہوتا۔وہ ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کرتا ہے کیونکہ اس کا جسم اتنا اکڑ چکا ہے کہ وہ اٹھ بھی نہیں سکتا۔

دربان اس پر، جس بدقسمت کے لیے ہر شے ہی بدل چکی ہے، جھکتا ہے۔''اب کیا ہے۔۔۔۔ جو تم جاننا چاہتے ہو؟'' دربان پوچھتا ہے۔''تم تو ایک ایسے شخص ہو جسے کبھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہر بندہ قانون کا حصول چاہتا ہے،'' آدمی کہتا ہے،''پھر کیا وجہ ہے کہ ان سارے بیتے سالوں میں میرے سوا کسی ایک نے بھی تم سے اندر جانے کی درخواست نہیں کی؟''

یہ جانتے ہوئے کہ مرتے بندے کی سماعتی حس بھی اپنے خاتمے پر ہے، دربان اونچی آواز میں کہتا ہے؛ ''یہاں سے تو کسی اور کو اندر جانے کی اجازت مل ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ راستہ تو صرف تمہارے لیے کھلا رکھا گیا تھا اور میں اسے اب بند کرنے لگا ہوں۔

ایک شاہی پیغام (۴)

لوگوں کا کہنا ہے کہ بادشاہ نے اپنے بسترِ مرگ سے تمہارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے، تم! جو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ اور حقیر بندے ہو، اس ننھے سائے کی طرح جو شاہی سورج سے انتہائی دوری پر منہ چھپائے پڑا ہو۔

بادشاہ نے پیامبر کو اپنے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہا اور اس کے کان میں پیغام بتا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ پیغام اہم ہے لہٰذا پیامبر اسے خود سے بھی سنائے کہ وہ ٹھیک سے سن پایا بھی ہے کہ نہیں۔قاصد نے پیغام دہرا دیا۔بادشاہ نے سر کے اشارے سے یقین کا اظہار کیا کہ قاصد نے پیغام کو درست سمجھ لیا ہے اور اس نے اپنے گرد دائرہ بنائے مملکت کے سب بڑوں اور اس سارے ہجوم کے سامنے جو سب بندھن توڑے، سیڑھیاں پھلانگے وہاں جمع تھے اور اس کی موت کے منتظر تھے، اسے وہاں سے روانہ کر دیا۔

اب پیامبر کو کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس نے اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرنا ہے جس پر سورج کا نشان بنا ہے، لہٰذا وہ بنا کسی مشکل کے آگے بڑھتا جاتا ہے، جیسا کہ شاید کوئی دوسرا نہ کر پاتا۔لیکن ہجوم اتنا زیادہ ہے کہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ویسے بھی یہ اگر کھلی جگہ ہوتی تو بھی وہ اڑ کر تو منزل پر پہنچ نہیں سکتا تھا کہ تم اس کے ہاتھ کی، دل کو اچھی لگنے والی، دستک اپنے دروازے پر سن

سکتے۔لیکن کیا ستم ظریفی ہے کہ اس کی تمام کوششیں نا کام ٹھہرتی ہیں۔ وہ تو ابھی بھی محل کے سب سے اندرونی حصے کے نجی کمروں سے ہی نکلنے کی جدو جہد میں پھنسا ہوا ہے جس میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو پائے گا اور اگر وہ ہو بھی گیا تب بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسے سیڑھیوں سے اترنے کے لیے جنگ کرنا ہوگی اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا ہے تو بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسے لمبی راہداریوں سے گزرنا ہوگا اور پھر ان راہداریوں کے بعد اس دوسرے محل سے گزرنا ہوگا جس نے پہلے والے محل کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور پھر ایک بار سیڑھیاں اور راہداریاں، اور پھر سے ایک محل، اور پھر سے یہ سب، جو ہزار ہا سالوں پر محیط ہے۔ اور اگر وہ بالآخر سب سے بیرونی دروازے کو پار کر بھی لیتا ہے۔۔۔ جو کہ کبھی نہیں، کبھی نہیں ہوسکتا۔۔۔ شاہی دارالخلافہ، دنیا کا مرکز، اب اس کے سامنے ہوگا، پہاڑ کی طرح ایستادہ، تہہ در تہہ۔ اب اسے کوئی نہیں روکے گا، یقیناً نہیں کیونکہ اب وہ ایک ایسا پیامبر ہے جو قاصد ہے ایک مرے ہوئے بادشاہ ایک عام بندے کا۔لیکن ایک تم ہو کہ شام ڈھلنے پر بھی اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھے اس پیغام کے منتظر ہو۔

پرومیتھیس (۵)

پرومیتھیس کی بارے میں چار قصے مشہور ہیں۔

پہلے کے مطابق، اسے کاکیشیا میں ایک چٹان کے ساتھ باندھا گیا تھا، کہ اس نے خداؤں کو دغا دیتے ہوئے ان کے راز انسانوں کو دے ڈالے تھے، اور خداؤں نے عقابوں کو اس پر نازل کر دیا تھا تا کہ وہ اس کا کلیجہ کھاتے رہیں، جو دائمی طور پر پھلتا پھولتا رہتا تھا۔

دوسرے کے مطابق، پرومیتھیس، چونچوں کی کلیجہ چیرنے والی درد سے مجبور ہو کر چٹان میں اندر اندر ہی دھنستا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ اسی کا حصہ بن گیا۔

تیسرے کے مطابق، ہزاروں سال کے عرصے نے اس کی غداری کو بھلا دیا، خدا بھی بھول گئے، عقاب بھی، اور خود اس نے بھی اسے فراموش کر دیا۔

چوتھے کے مطابق، ہر کوئی اس معاملے سے اکتا گیا۔ خدا بھی اکتا گئے، عقاب بھی تنگ آ گئے، اور زخم بھی اکتاہٹ سے اتنا چور ہوا کہ اس نے خود کو سی لیا۔

اب بس چٹان کا ڈھیر ہی بچا ہے جس کی کوئی توجیح نہیں پیش کی جا سکتی لیکن 'قصہ' توتوجیح پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا کیونکہ یہ سچائی کی تہہ کے نیچے سے نکلا ہوا تھا لیکن اس کا کیا کریں کہ یہ بھی بالآخر نا قابل توجیح بن کر رہ گیا ہے۔

رختِ سفر (۶)

میں نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ وہ میرا گھوڑا اصطبل سے لائے، لیکن وہ میری بات سمجھ نہ پایا یوں مجھے خود ہی اصطبل میں جانا پڑا۔ میں نے گھوڑے پر کاٹھی کسی اور اس پر سوار ہو گیا۔ مجھے ڈور ایک 'ٹرمپیٹ' (بگل نما ایک ساز) کی آواز سنائی دی اور میں نے نوکر سے پوچھا کہ یہ کس لیے بج رہا ہے۔ اس کو کچھ معلوم نہ تھا اور نہ ہی اس نے ٹرمپیٹ کی آواز سنی تھی۔

اس نے مجھے مرکزی دروازے پر روکا اور پوچھا: ''مالک آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا''، میں نے کہا، ''میں تو بس یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے باہر اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں، مجھے یہی ایک راستہ نظر آتا ہے کہ اس طرح میں اپنی منزل پا لوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنی منزل کا پتہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں،'' میں نے جواب دیا، ''میں نے تمھیں ابھی بتایا تو ہے، یہاں سے باہر نکلنا، یہی میرا مقصد ہے۔''

''لیکن آپ نے زادِ راہ تو لیا ہی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ سفر اتنا لمبا ہے کہ کوئی زادِ راہ مجھے نہیں بچا سکتا، بہر حال یہ ایک بہت ہی شاندار سفر ہے۔''

☆

ایک مختصر حکایت (۷)

''افسوس!'' چوہے نے کہا، ''ساری دنیا ہر دن مختصر سے مختصر ہوتی جا رہی ہے۔ شروع میں یہ بہت بڑی تھی کہ مجھے اس سے خوف آتا تھا اور جب مجھے اپنے دائیں اور بائیں دیواریں بہت دور دکھائی دیتی تھیں تو میں خوش ہوتا تھا لیکن اب یہ دیواریں تیزی سے اتنی قریب آ گئی ہیں کہ میں خود کو آخری کمرے میں محبوس پاتا ہوں، جس کے ایک کونے میں وہ کٹکٹی لگی ہے جس میں مجھے لازماً جا پھنسنا ہے۔''

''تمھیں صرف اپنی سمت بدلنے کی ضرورت ہے۔'' بلی نے کہا اور اسے کھا گئی۔

------

(۱) ''Ein Traum'' نامی یہ کہانی 1917ء میں پہلی بار پراگ میں 'Das jüdische Prag' میں شائع ہوئی تھی بعد ازاں 1919ء میں 'Ein Landarzt' (Doctor A Country) نامی مجموعے کا حصہ بنی جسے انگریزی میں وِلا اور ایڈون موئیر نے ترجمہ کیا تھا۔

(۲) فرانز کافکا کی یہ کہانی 'Hoftor Der Schlag ans' اس کے مرنے کے نو سال بعد 'Bau der Chinesischen

'Mauer Beim' (برلن، 1931) میں شائع ہوئی تھی جس کا پہلا انگریزی ترجمہ' آرکیڈین' شاعر، ناول نگار اور مترجم ایڈون موئیر (Edwin Muir) نے اپنی بیوی وِلا (Willa)، جو خود بھی ناول نگار، انشا پرداز اور مترجم تھی، کے ساتھ مل کر 1933ء میں 'The Great Wall of China' 'Manor Gate Knock at the The' کے نام سے کیا تھا۔ یہ بعد میں 'Stories and Reflections' نامی مجموعے میں شامل ہوا۔' آرکیڈین: آرکنی (Orkney) جزائر کے مقامی باشندوں کو کہتے ہیں جو سکاٹ لینڈ، برطانیہ کے شمال میں واقع ہیں۔

(۳) ''Vor dem Gesetz'' نامی یہ فلیش فکشن/کہانی یا تمثیل کافکا کی زندگی میں ہی سب سے پہلے 1915ء میں ہفت روزہ 'Selbstwehr' میں شائع ہوئی تھی پھر یہ 1919ء میں 'Ein Landarzt' نامی مجموعے میں چھپی جو بعد میں 'A Country Doctor' کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہوا تھا اور آخر 1925ء میں یہ 'Der Prozes' کا حصہ بنی جو 'The Trial' کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ یہاں جس انگریزی ترجمے کو اردو قالب میں ڈھالا گیا ہے وہ وینکوور آئی لینڈ یونیورسٹی کے آئن جونسٹون' کا ہے۔

(۴) ''Beim Bau der Chinesischen Mauer'' نامی کہانی کافکا نے 1917ء میں لکھی تھی جس میں ''Eine kaiserliche Botschaft'' نامی یہ فلیش فکشن/کہانی/تمثیل بھی حصہ تھی لیکن یہ اس کے مرنے کے سات سال بعد ''Beim Bau der Chinesischen Mauer'' نامی مجموعے میں شائع ہوئی۔ ''Eine kaiserliche Botschaft'' اپنی آزاد حیثیت میں '' Ein Landarzt'' میں 1919ء میں ہی شائع ہو چکی تھی۔ وِلا اور ایڈون موئیر نے انگریزی میں اس مجموعے کا ترجمہ 1933ء میں 'A Country Doctor' کے نام سے کیا تھا۔

(۵) ''پرومیتھیس'' کافکا نے غالباً 1918ء میں لکھی تھی لیکن یہ پہلی بار '' Beim Bau der Chinesischen Maue '' (1931) میں شائع ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ 1933ء میں وِلا اور ایڈون موئیر نے کیا تھا اور یہ 'The Great Wall of China. Stories and Reflections' میں شامل ہے۔ ''پرومیتھیس'' یونانی دیومالا میں ایک' ٹائٹن' (Titan) الوہی مخلوق میں دوسرے درجے کا دیوتا ہے جس نے بنی نوع انسان کو تخلیق کیا تھا اور اس کا خیر خواہ بھی تھا۔ اس نے اولمپس پہاڑ سے آگ چرا کر انسان کو دی تھی جس کی پاداش میں زیوس (Zeus)، جو اولمپس پہاڑ کے خداؤں کا بھی خدا ہے، نے اسے کاکیشیا میں کازبک پہاڑ پر ایک چٹان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور اس پر عقاب چھڑوا دیتا ہے، جو اس کا کلیجہ ہر دن کھاتا ہے، رات میں پرومیتھیس کا جگر پھر سے نشوونما پاجاتا ہے جسے عقاب اگلے دن پھر سے نوچ کھاتا ہے۔ مدتوں بعد یونانی دیومالا کا ہیرو ہرکولیس عقاب کو مار کر ''پرومیتھیس'' کو عقاب کے عذاب سے نجات دلاتا ہے۔

یونانی دیومالا میں ہی ''پرومیتھیس'' بارے چار روایتیں ہیں۔ جس کو مدنظر رکھتے ہوئے کافکا نے بھی یہ کہانی اپنے انداز میں چار طرح لکھی ہے۔

(۶) Der Aufbruch نامی یہ کہانی غالباً فروری 1920ء اور فروری 1921ء کے درمیان لکھی گئی تھی جو کافکا کے مرنے کے بعد 'Beschreibung eines Kampfes: Novellen,Skizzen, Aphorismen aus dem Nachlaß' نامی مجموعے میں 1936ء میں میکس براڈ نے شائع کی تھی۔ اس سے یہ بھی منسوب ہے کہ اسی نے اس کہانی کو 'Der Aufbruch' کا نام دیا تھا۔

(۷) Kleine Fabel یہ افسانچہ کافکا نے 1920ء کے لگ بھگ لکھا تھا۔ آپ اسے ایک 'Anecdote' بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ کافکا کی زندگی میں تو شائع نہ ہو سکا البتہ 1931ء میں یہ 'Beim Bau der Chinesischen Mauer' نامی جریدے میں چھپا، اس کی پہلا انگریزی ترجمہ 'A Little Fable' 1933ء میں لندن سے شائع ہوا۔ بعد میں یہ 'The Great Wall of China. Stories and Reflections' میں شامل ہوا۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

بادِ غرغر

کچھ دن پہلے ڈیوٹی سے واپس آنے اور کھانے سے فراغت کے بعد ہاضمہ درست کرنے ذرا باہر نکلا۔ تھوڑی دیر آتی جاتی گاڑیوں کی غرغر اور زن سے گزرنے پر سوچتا رہا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہم اسی سڑک پر گرمیوں میں چادریں بچا کر سویا کرتے تھے اور اب اژدھام اتنا کہ دوسری طرف جانا بھی کارِ دارد ہے۔ ہم چونکہ برلب سڑک رہتے ہیں، اس لیے غرغر کے عادی سے ہو گئے ہیں۔ اس لیے بادِ غرغر محسوس نہیں ہوتی۔ اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ جب تھوڑی دیر کھڑا موبائیل میں مصروف تھا، تب ایک منحنی سا لمبا تڑنگا شخص اک دم ہاتھ پھیلا کر بولا: ''دو سو روپے ہوں گے'' ۔ میرے انہماک کا گلا گھونٹنے والے اس لایعنی منگتے کو میں نے غضب ناک انداز میں دیکھا تو یقین کی حد تک گمان گزرا کہ مریل پکا چرسی ہے۔ تب روکھے لہجے میں کہا: ''نہیں بھئی''۔ جھینگر سُر سرا رہے تھے۔ طرہ اس پر کوئی چرسی منگتا کچھ مانگے۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ اور میں تقریباً یہ واقعہ بھول بھال گیا۔ ایک روز نامانوس آواز میں قریبی مسجد سے اذان سنی، تب فیضان بیٹے سے پوچھا کہ کیا دوسری مسجد میں کوئی نیا مولانا آیا ہے؟ تو اس نے کہا نہیں یہ تو بادِ غرغر ہے ہمارے سامنے والی سڑک کے اس پار خان والے کچے گھر کا نیا ہمسایہ ہے۔ چونکہ میں اکثر متصل دوسری مسجد جاتا ہوں اس لیے اس مطلوبہ بادِ غرغر ہمسایے سے ناواقف تھا اس لیے تعجب کے ساتھ ہنسی بھی چھوٹی کہ بادِ غرغر۔ یہ کون محترم ہیں جو اس قدر عجیب وغریب نام سے متصف ہے۔ تب ایک دفعہ جب فیضان ساتھ کھڑا تھا تو اس نے آتے شخص کو اشارہ کر کے کہا۔ وہ بادِ غرغر ہے۔ میں نے تجسس سے جب اس محترم کی طرف دیکھا تو فوراً ندامت سی محسوس کرنے لگا کہ یہ وہی منگتا بادِ غرغر ہے جس کو میں نے بڑے روکھے انداز میں دھتکارا تھا۔ افسوس سے پہلے ہی فیضان نے بادِ غرغر کا جغرافیہ پیش کیا کہ یہ بازاروں میں بھیک مانگتا پھرتا ہے اور پکا چرسی ہے۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا، اور نہ اس کے تین مشٹنڈے بیٹے سوائے ایک کے محنت کرتے ہیں۔ بس سوالی پیسوں سے بادِ غرغر کا کنبہ چل رہا ہے۔ یعنی میری قیافہ شناسی عین درست نکلی کہ بادِ غرغر واقعی قابل کراہیت شخص ہے۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ اردو میں اس نئے لفظ کو کس نے کس کونے سے داخل کیا تو قارئین کرام اردو لغات اس پر خاموش ہیں۔ کیونکہ یہ فارسی الاصل اور پشتو زبان میں اس ہوا کو کہتے ہیں جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر تیز چلتی کانوں میں غرغراہٹ پیدا کرتی ہے۔ یا اسم صوت کہ

لیں جب کوئی مرغ مرغی کو پٹاتا ہے تو سات پڑے دانوں پر ٹونگے مار مار کر اور گلے سے غرغر کی آواز نکالتا ہے تاکہ مرغی کا التفات حاصل کریں اور عقل سے پیدل مرغیاں بھی بالکل صنف نازک کی طرح یوں دوڑے چلی آتی ہیں کہ جیسے صاحب بہادر نے ہی دانہ ڈالا ہوا ہے جبکہ یہ کام نصف بہتر کرتی ہے۔ جب زائد روٹی کے ٹکڑے کر کے ایک طرف مرغیوں کو کھلانے کے لیے ڈالتی ہے جبکہ شوہر نامدار کے آگے کھانا پٹخ کر رکھ دیتی ہے اور ساتھ بڑبڑا بھی رہی ہوتی ہے۔ اچھا تو صاحبو اب تو آپ کو بادِغرغر کی صحت لفظی پر اعتراض ختم ہو گیا ہوگا۔ اگر نہیں ہوا تو میری بلا سے۔ اب آتے ہیں ذرا موصوف بادغرغر کی اوصاف حمیدہ وقبیحہ کی طرف، تو جناب والا بادِغرغر میں مذکور قباحتوں کے علاوہ چند صفات بھی ہیں کہ بندہ پکا نمازی اور بے ضرر سا بندہ ہے۔ بیشک غریب ہے اور پرائے خان کے کچے تین مرلہ مکان میں پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں سمیت ایک عدد بیگم کو بھی پال رہا ہے مگر رزق پیدا کرنے کا طریقہ قابل مذمت ہے۔ دوسری بات کہ بادِغرغر کے بچے گو نکمے سہی لیکن غلط بالکل نہیں۔ بڑے تابعدار اور علیک سلیک والے ہیں، خصوصا میرا بہت لحاظ کرتے ہیں ۔اب اگر وہ والد کا سہارا نہیں بنتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ معلوم ہوا ہے کہ تھوڑا بہت کما لیتے ہیں۔ محنت مزدوری کر کے صرف اپنی جامہ زیبی اور عیاشی میں خون پسینے کی کمائی اڑاتے ہیں۔ ان پر غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے کہ غربت نے پڑھنے نہیں دیا تو اب گل چھرے تو مت اڑاو۔ جب تک بادِغرغر ہمارا ہمسایہ ہے تو ہمسائیگی تو نبھانی ہے نا۔ چلو آتے ہیں کہ جمعہ خان سے بادِغرغر تک کا سفر موصوف نے کیسے طے کیا، تو ہمارے مولانا مقصود وکیل صاحب نے اس کی عادتوں کو دیکھ کر اس نام سے متصف کیا۔ کہ موصوف غرادھر تو غرادھر یعنی تابعداری میں وقت ضائع کیے بنا جٹ پٹ کام پورا کرتا ہے۔ اور اب تو باقاعدہ موذن بھی بن گیا ہے۔ مسجد کی خدمت بھی کرتا ہے ۔بقول فیضان ایک دفعہ مسجد میں چندہ والے آئے تو اس نے دس روپے ایک بچے کو تھما کر کہا کہ ان لوگوں کو جا کر کہیں بادِغرغر نے دیے ہیں۔ بچہ جب دس روپے دے آیا تو چندہ خور کی لحن طرازیاں لاوڈ سپیکر کے پردے پھاڑنے لگی۔ کہ اللہ بادغرغر سے راضی ہو جس نے دارالعلوم کے لیے دس روپے کا چندہ دیا۔ تیسری بار کہنے پر بادِغرغر نے دوسرا بچہ مسجد دوڑا دیا کہ میرا نام یوں سر عام نہ لیں ورنہ سارے گاؤں کا جمعہ خان کے بجائے بادِغرغر ہو جاؤں گا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کیونکہ اب یہ اواز انسانوں کی زبانوں پر تو کیا؟ کتوں، مرغیوں مرغوں اور بعض گاڑیوں حتیٰ کہ اڑتے ہوائی جہاز سے بھی آتی ہے۔ یعنی بادِغرغر کی شہرت چاردانگ پھیلی ہوئی ہے۔

انٹرویو

سوالات: سید نصرت بخاری جوابات: مشتاق احمد نوری:

مشتاق احمد نوری، حفیظ الدین احمد مرحوم کے گھر 7۔ مئی 1950 بروز اتوار بہ وقت 9 بجے شب گوگی پوٹھیا، فاربسگنج، ضلع ارریہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامی رجوکھر عیدگاہ سے چوتھی جماعت سے اول نمبر میں کامیابی حاصل کی اور سیدھے آٹھویں کلاس میں آزاد اکادمی ارریہ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ہائیر سکنڈری امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور اسکول کے سبھی سابق ریکارڈ توڑ دیے۔ پورنیہ کالج پورنیہ سے بی۔ ایس۔ سی پاس کیا اور پٹنہ یونی ورسٹی سے بی۔ ایڈ میں ٹاپ کیا۔ 1977 میں پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سے ملازمت میں انتخاب ہوا۔ مختلف ضلعوں میں انفارمیشن و پبلک ریلیشنز آفیسر رہے۔ دوبار کابینہ منسٹر کے سیکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ایک بار بہار کے وزیر اعلیٰ کے چیف پبلک ریلیشنز آفیسر رہے۔ دو کمشنری میں محکمے کے ریجنل ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا۔ دوبار بہار اردو اکادمی کے سیکریٹری کا عہدہ ان کے پاس رہا۔

ان کے تین افسانوی مجموعے 1۔ تلاش 2۔ بند آنکھوں کا سفر 3۔ چھت پہ ٹھہری دھوپ شایع ہو چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ زیر طباعت ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں جو رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے ہندو پاک کے سبھی معتبر رسائل میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ، دربھنگا اور دہلی سے افسانے نشر ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے ''دوردرشن'' سے بھی کئی پروگرام نشر ہوئے۔ لندن، کویت، دوبئی، قطر اور سعودی عرب میں مختلف انٹرنیشنل پروگراموں میں شرکت کر چکے ہیں۔ جدہ، قطر، کویت اور دوبئی، سے اردو کی خدمات کے حوالے سے ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ انڈیا (بہار، پٹنہ) میں قیام پذیر ہیں۔

●:۔ آپ بہار میں اردو اکیڈمی کے سربراہ رہے؛ کیا اردو کے حوالے سے پہلا تجربہ تھا؟ تجربہ کیسا رہا؟

جواب: میں اردو اکادمی کا سکریٹری دوسری بار بنایا گیا۔ اس سے قبل 1993 سے 1996

تک رہا تھا۔ دوسری بار اگست 2015 سے اگست 2018 تک رہا۔ میرے ساتھ معاملہ یہ ہوتا ہے کہ میں کام کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ نئے نئے کام اپنی مجلسِ عاملہ کی میٹنگ میں پیش کرتا ہوں اور ان کی منظوری کے بعد اسے انجام دیتا ہوں۔ اردو ادارے میں اگر کام کیا جائے تو بہت سے چھٹ بھیئے آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے جو فیض یاب نہیں ہو پا رہے وہ آپ کے دشمن بن جائیں گے۔ کام جب اصول کی بنیاد پہ ہوگا تو پھر ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہر کسی کو خوش کرنا بہت مشکل ہے۔ کتاب پر انعام 21000، 15000 اور 10000 ہے۔ کتاب پر مبصر کی رائے ذیلی کمیٹی کے مشورے اور پھر مجلسِ عاملہ کی منظوری کے بعد ہی دیا جاتا ہے لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ پہلی کتاب شائع ہو تو بس اول انعام ہی چاہیے اس سے کم پر سمجھوتہ نہیں۔ اور گاج کرنا ہے صرف سکریٹری پر ہی کہ ان سب کا ذمہ دار وہی ہے۔

اسی ماحول میں کام کرنا پڑتا ہے۔ مجلسِ عاملہ کے ارکان جاہل نہیں ہوتے۔ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ہوتے ہیں اور باقی وزیر اعلیٰ کے ذریعہ منتخب کردہ۔ اتنے لوگوں کے درمیان فیصلہ ہوتا ہے پھر بھی من مانی کا الزام بہت آسانی سے لگا دیا جاتا ہے۔ میرا دونوں دور کافی ہلچل بھرا رہا۔ اچھے لوگوں کے تعاون سے بہتر کام کرنے کا موقع ملا اور بہت سے نئے کام بھی کیے جو آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک اچھی بات یہ ہے کہ میں کسی بھی دباؤ میں آئے بغیر کام کرتا ہوں اور لیک سے ہٹ کر کام کرنے کا عادی رہا ہوں۔ کاموں کی تفصیل اس لیے نہیں دے رہا کہ یہ خودستائی کہلائے گی۔ کسی بھی ادارے کا بجٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتا ہے۔ میرے پہلے دور میں بجٹ صرف دس لاکھ تھا جسے میری کاوش سے پچیس لاکھ کر دیا گیا۔ دوسرے دور میں تقریباً بیس سال بعد بجٹ پچیس لاکھ سے بڑھ کر چالیس لاکھ ہوا۔ کام کے لیے سرکار سے الگ سے رقم مختص کرانی پڑتی تھی لیکن میں نے اللہ کے کرم سے اس چالیس لاکھ کی بجٹ کو فایننس کمشنر سے ڈسکشن کر کے سیدھے ڈھائی کروڑ کروا دیا۔ تین سال رہا، تینوں سال یہ رقم اکادمی کو ملی۔ اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے جتنے بھی کام ممکن تھے وہ میرے دور میں کیے گئے۔ اللہ کا کرم رہا کہ کام کا تجربہ بہت بہتر رہا۔ میں اپنے کام سے مطمئن رہا اور مجھے محکمہ کے پرنسپل سکریٹری کے ساتھ سبھی افسران کا بھرپور تعاون رہا ورنہ میرے لیے ایک قدم چلنا بھی دشوار ہوتا۔

● سوال: ادبی ادارے کے سربراہ کے فرائض کیا ہو سکتے ہیں، وہ فرائض سے آگے جا کر ادب اور ادیب کی کیا خدمت کر سکتا ہے؟

جواب: دیکھیے ہر ادارے کا ایک لائحہ عمل ہوتا ہے جس کا نفاذ ادارے کے سربراہ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں اگر سربراہ چاہے کہ کچھ نئے کام بھی کیے جائیں تو وہ پروجیکٹ بنا کر مجلس عاملہ کی منظوری لے۔ خرچ ہونے والی رقم کی منظوری لے لے، پھر اپنے وژن کے مطابق کام کرے۔ اہم یہ ہے کہ آپ کے اندر وژن ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو آپ کام کو آگے بڑھائیں گے اگر نہیں ہے تو کرسی توڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے خالص خواتین ادبا و شعرا پر مشتمل دو پروگرام کیے جس میں ایک بھی مرد نے منچ شیئر نہیں کیا۔ خواتین کے فن پر ہی گفتگو کی گئی۔ صدارت و نظامت بھی انھیں کی رہی۔ ان پر مشتمل مشاعرہ بھی ہوا۔ ایسا پروگرام ہندو پاک میں پہلی بار ہوا۔ اب ماشاءاللہ ایسے پروگرام دیگر اکادمیاں بھی کرنے لگی ہیں۔ اگر میں نے اپنے وژن کو کام میں نہیں لایا ہوتا تو پھر ایسے پروگرام نہیں ہوتے۔ ادارے کا سربراہ خود مختار ہوتا ہے وہ چاہے تو ترقیاتی کاموں کو ایک نیا شیپ دے سکتا ہے لیکن اس بات کا دھیان رہے کہ وہ اس معاملے میں مجلس عاملہ کی منظوری حاصل کر لے۔ باقی اس کی مالی اوقات جتنی ہے اس کے دائرے میں کام کرنے کے لیے وہ آزاد ہوتا ہے۔

● سوال: اس طرح کے ادارے ہندوستان میں اُردو زباں کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔؟ اگر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: دیکھیے جو بھی سرکاری ادارے ہیں انہیں کام کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ کیا کرنا ہے یہ بھی پہلے سے معلوم ہوتا ہے لیکن ادارے کے سربراہ پر منحصر کرتا ہے کہ وہ کس انداز سے ادارے کو چلاتا ہے۔ وہ اگر ایماندار اور تیز طرّار ہے تو کام کی رفتا تیز ہوتی ہے ادارے کا نام ہوتا ہے لیکن اگر وہ کاہل ہے یا کام کرنے میں ماہر نہیں ہے یا اس کے پاس اپنا وژن نہیں ہے تو کام کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور ادارے کے ساتھ سرکار بھی بدنام ہوتی ہے۔ ویسے عام طور پر ادارے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ اب بہار کو ہی لیں میرے بعد محکمہ کے ہی ایک آفیسر کو سکریٹری کے عہدے کا انچارج بنایا گیا۔ ان کے پاس نہ ویژن ہے نہ ہی انہیں اردو ادب سے کبھی مطلب ہی رہا اس لیے اگست

2018 کے بعد اردو کی ترویج و اشاعت کا ایک بھی کام نہیں ہوا۔ اب ریگولر سکریٹری کا انتخاب ہوگا تو کام کی رفتار بڑھے گی۔

● سوال نمبر: بعض انڈین دوستوں کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ انڈیا میں اردو رسم الخط کا وجود خطرے میں ہے۔ آپ کی رائے؟

جواب: اردو رسم الخط کا مسئلہ انڈیا میں ہے۔ یار لوگ چالیس سال سے زاید عرصے سے گاہے بگاہے رسم الخط کے بدلنے کا راگ الاپتے ضرور ہیں لیکن اسے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ اور اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ رسم الخط بدلنے سے اردو اردو کہلانے کا حق کھودے گی۔

● سوال: پاکستان میں ایک نوجوان خوبصورت ماڈل کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس شعبہ سے وابستہ لوگوں نے بہت شور مچایا کہ اس ماڈل نے کون سا تیر مارا ہے۔ بعد میں ان کے حکمران جماعت کے ایک وزیر سے تعلقات کی خبریں بھی نشر ہوئیں۔ کیا ادبی اداروں میں بھی بڑی سیٹوں پر تقرر کے لیے حسن و جمال کار آمد ہے؟ تقرر کرنے والے اتنے غیر محتاط ہو سکتے ہیں کہ وہ اہل مرد کی بجائے نا اہل خوب صورت خاتون کا تقرر کر دیں؟

جواب: ادبی اداروں میں حسن و جمال سے کیا لینا دینا؟ ہمارے یہاں تقرر کی بنیاد ادبی صلاحیت مانی جاتی ہے اور عام طور پر یہی کوشش ہوتی ہے کہ قابلیت کی بنیاد پر انتخاب ہو لیکن کبھی کبھار سیاسی پیروی کے چلتے کمزور لوگ بھی فیض یاب ہو جاتے ہیں اور ادبی اداروں کا نقصان کر جاتے ہیں۔

● سوال: احمد ندیم قاسمی ایک کمیٹی کا حصہ تھے۔ کمیٹی نے انھیں کی کتاب کو انعام کے لیے نامزد کر دیا۔ جس پر مخالفین نے ہر فورم پر اعتراض کیا۔ آپ کے پیشِ نظر ایسے انتخاب کے لیے معیار کیا رہا؟

جواب: احمد ندیم قاسمی کوئی معمولی نام نہیں ہے، ان کی حیثیت لیجنڈ جیسی ہے۔ یہاں دو سوال ہیں۔ پہلا یہ کہ قاسمی کی کتاب واقعی دیگر کتاب سے اگر ہر لحاظ سے بہتر تھی تو اسے اس بنیاد پہ رد کرنا کہ کمیٹی کے ممبر ہیں اس لیے نہیں دیا جائے؛ مناسب نہیں ہے۔ لیکن ایک ممبر کی کتاب کو دیگر اچھی کتب پر فوقیت دینا غیر مناسب ہے۔ انعام ہمیشہ معیار کی بنیاد پر ہی دیا جانا چاہیے۔ ادارہ یہ اصول بنا سکتا ہے کہ کمیٹی کے ممبران کی کتاب زیرِ غور نہیں ہوگی چاہے وہ

بہترین ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر یہ اصول نہیں ہے تو آپ کمیٹی کے ممبر کو ان کے حق سے کیسے محروم کر سکتے ہیں۔

● سوال: سیٹ چھوڑنے کے بعد دوستوں کے رویے تبدیل ہوئے؟

جواب: بہار اردو اکادمی کی سکریٹری شپ چھوڑنے کے بعد دوستوں کے رویّے میں کوئی خاص تبدیلی اس لیے نہیں آئی کہ وہ میرے پرانے شناسا تھے لیکن جن کی دوستی غرض والی تھی انہیں نظر پھیرنے میں دیر بھی نہ لگی کہ دنیا کا دستور بھی یہی ہے۔

● سوال: سیاسی وجوہات کی بنا پر ہم پاکستانی اہلِ قلم بنگلہ دیش میں اردو سرگرمیوں سے بالکل لاعلم ہیں؛ اس حوالے سے آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں؟

بنگلہ دیش میں اردو کی حالت بہت بہتر نہیں ہے۔ اردو اخبار تو نکلتا بھی نہیں۔ کئی سال قبل بنگلہ دیش کا ایک وفد پٹنہ آیا تھا، مجھے بھی ان سے ملنے بلایا گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہاں اردو اخبار دیکھ کر رونا آ گیا کہ ہم نے برسوں سے اردو اخبار نہیں دیکھا ہے۔ جن کا تعلق بہار سے ہے انہیں تو ووٹ دینے کا بھی حق نہیں ہے۔ انہیں مکمل شہری حقوق حاصل نہیں ہیں، اس لیے انہیں گھٹ گھٹ کر جینا پڑ رہا ہے۔ ہاں یونیورسٹی میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ کچھ شعری مجموعے بھی میرے پاس آجاتے ہیں لیکن وہاں کے بنگلہ زبان والوں کو اردو سے کوئی مطلب نہیں ہے اس کا دائرہ بہاری مسلمانوں تک ہی محدود ہے۔

● سوال: گیان چند جین" ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" ص نمبر 216 میں لکھتے ہیں کہ" ہندوستان سے باہر اردو کو صرف پاکستان کی زبان مانا جاتا ہے"۔ اس کے متعلق آپ کی رائے؟

جواب: ایک بات واضح کردوں کہ گیان چند جین کو اردو نے ہی مالا مال کیا لیکن وہ بہت ہی متعصب تھے اردو کے تئیں۔ ان کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ'' ان کی ذہنی فتور کی غمازی کرتی ہے۔ اس کتاب پر بہت جارحانہ تبصرے بھی ہوئے۔ ان کا یہ کہنا کہ ہندوستان سے باہر اردو کو صرف پاکستانی زبان مانا جاتا ہے سراسر غلط ہے۔ میں نے سعودی عرب، قطر، دبئی اور کویت کی ادبی محفلوں میں شرکت کی ہے۔ وہاں اردو بزم ہندوستانیوں کے دم سے قائم ہے۔ صرف کویت میں پاکستانی حاوی ہیں۔ فروغ اردو قطر ایوارڈ کے روح رواں صبیح بخاری ہیں جن کا تعلق بھوپال سے ہے۔ قطر کی ساری ادبی تنظیموں کی سرپرستی بخاری ہی

کرتے ہیں۔ گیان چند جین کی بات قابلِ اعتنا نہیں ہے۔

● سوال: انڈیا کے ایک مہربان کہتے ہیں کہ انڈیا میں اردو زبان اور رسم الخط کو شدید خطرات لاحق ہیں، ان کے بقول بے شمارہ انڈین اردو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے انڈیا میں اردو کا چلن ختم ہو رہا ہے۔ آپ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں؟

جواب: اس میں قدرے سچائی ہے۔ انڈیا کے ایلٹ طبقے کے بچے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں، گارجین کی بے توجہی کی وجہ سے اردو سے نابلد رہ جاتے ہیں۔ کشمیر کے بعد بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے یہاں بہتر صورت ہے، لیکن چنائی، کیرل، آسام، ناگالینڈ، راجستھان جیسے علاقے میں صورت بہتر نہیں ہے۔ وہاں قران بھی ہندی میں پڑھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر مدارا اَور وَسط درجے کے لوگ اردو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی اردو کے جنازے کا وقت نہیں آیا۔ پاکستان میں بھی علاقائی زبان اردو پر حاوی ہے اور ابھی تک اردو وہاں کی قومی زبان نہیں بنی ہے۔ کم و بیش اردو کے معاملے میں دونوں ملکوں کے مسائل ایک جیسے ہی ہیں۔

● سوال: ادب سے متعلق سرکاری اداروں کے فنڈ سے وفاقی یا صوبائی دارالحکومتوں کے چھوٹے بڑے ادیب مستفید ہوتے ہیں۔ دور دراز علاقوں میں ادب تخلیق کرنے والے ہمیشہ نظرانداز ہوئے ہیں، کیا آپ نے دور دراز کے ادیبوں تک پہنچنے کی کوشش کی؟

جواب: بہار اردو اکادمی کا دائرۂ عمل صوبائی سرحد تک محدود ضرور تھا لیکن ایوارڈ اور کتابوں پر انعام ملک گیر سطح پر دیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اکادمی اپنے سب سے بڑے ایوارڈ کے لیے جوگیندر پال اور شکیل الرحمٰن کا انتخاب کیا، جن کا تعلق دہلی سے تھا اور ان دونوں کو ایک لاکھ اکاون ہزار روپے سے نوازا، اِسی طرح جیلانی بانو حیدرآباد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی علی گڑھ کو ایک لاکھ اکاون ہزار کا ایوارڈ دیا گیا۔ ایک لاکھ ایک ہزار کا ایوارڈ مجتبٰی حسین حیدر آباد، پروفیسر ارتضٰی کریم دہلی اور پروفیسر خواجہ اکرام دہلی کو دیا گیا۔ اکاون ہزار کے ایوارڈ چنائی کے علیم صبا نویدی، دہلی کے مشرف عالم ذوقی اور عابد انور کو دیا گیا۔ جمیل اختر علی گڑھ کو بھی اکاون ہزار کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس طرح اگر آپ دیکھیں تو ادب میں گراں قدر خدمات کی بنیاد پر ہی میری سکریٹری شپ میں ایوارڈ دیے گئے اور بہار سے باہر کے ادیبوں کو ہی بڑے ایوارڈ دیے گئے۔ یہی حال کتابوں پر انعام کا رہا جو بالترتیب اکیس

ہزار پندرہ ہزار اور دس ہزار کے تھے۔ میرے آنے سے قبل سب سے بڑا ایوارڈ صرف اکاون ہزار کا تھا، جسے میں نے ایک لاکھ اکاون ہزار کر دیا۔ کتاب پر اول انعام دس ہزار کا تھا جسے میں نے اکیس ہزار کر دیا۔ یہ سارے فیصلے اکادمی کی پہلی مجلس عاملہ کی بیٹھک میں ہی میں نے پرپوزل رکھ کر منظور کروا لیے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد غضنفر کو بھی اکاون ہزار کا ایوارڈ دیا گیا، اس کے علاوہ بہار میں رہ رہے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کو بھی مختلف درجے کے ایوارڈ دیے گئے۔ میرے آنے کے بعد یہ سارے پروگرام معطل ہیں۔ میں نے ایک نیا سلسلہ ''اکادمی آپ تک'' بھی شروع کیا تھا جس میں ہر ضلع سے تین ایسے بزرگ ادبا و شعرا کا انتخاب کرتا جنھیں کسی ادارے نے ایوارڈ نہیں دیا ہو۔ ان کے ضلع میں جا کر انہیں اکیس ہزار کی رقم مومنٹو و سند کے ساتھ شال پوشی کرتا، ان کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھواتا، ضلع کے مقامی شعرا پر مشتمل مشاعرے کرواتا اور انہیں بھی رقم دی جاتی۔ میرا یہ پروگرام سب سے زیادہ مقبول رہا اور اسے پوری اردو دنیا نے سراہا۔ بہار میں ایسے بہت سے بزرگ و فعال ادبا و شعرا ہیں جنھیں کسی ادارے یا محکمہ نے نہیں پوچھا۔ مجھے خیال آیا کہ جب اکادمی انعام و اکرام سے نوازتی ہے تو یہ بزرگ گوشہ نشیں کسی کی نگاہ میں نہیں آتے۔ میں نے ایک پروجیکٹ بنایا کہ بہار کے ہر ضلع سے پہلے فیز میں تین بزرگوں کا انتخاب کیا جائے، اُن کی ادبی خدمات پر مقالے لکھوائے جائیں۔ ان پر ایک مقرر تقریر کرے تا کہ اُس ضلع کے لوگ اپنے لعل کی خدمات سے واقف ہوں۔ ایک ضلع کے پورے پروگرام میں مشکل سے ایک لاکھ کا خرچ آتا تھا۔ میں نے پہلی ہی بیٹھک میں اس پروجیکٹ کو پیش کیا جسے مجلس عاملہ نے منظور کر لیا اس طرح ہر ضلع کے لیے مجھے ایک لاکھ کی منظوری مل گئی لیکن نام کے انتخاب کی ذمہ داری میں نے اپنے پاس رکھی۔ اپنے دونوں وائس چیئرمین سے مشورہ کر کے ہر ضلع کے لیے تین نام انتخاب کرواتا، پھر اسی ضلع کے ادیبوں سے تینوں پر مقالے لکھواتا اور اسی طرح تین ادیب تقریر کے لیے چنے جاتے۔ اس ضلع کے سبھی شعرا کی فہرست مقامی ادیبوں کے تعاون سے مرتب کرتا۔ جب سب کچھ تیار ہو جاتا تو ان سبھی متعلقہ حضرات کو مقررہ ہال میں آنے کی دعوت دیتا۔ ان تینوں کے لیے مومنٹو اُن کے نام کے بنوائے جاتے، سند تیار کی جاتی۔ تینوں کے لیے اکیس ہزار کے لفافے تیار رہتے، چیک اس لیے نہیں دیتا کہ کچھ کے اکاؤنٹ بھی نہیں ہوتے تھے۔ اُس

ضلع میں اگر یونیورسٹی ہوتو وہاں کے وائس چانسلر کو بلواتا۔ ایوارڈ دینے کو کبھی محکمہ کے وزیر، کبھی مقامی ایم ایل اے، یا ضلع کلکٹر سے انہیں ایوارڈ دلواتا۔ اُن مستحق ادیبوں کی شال پوشی ہوتی۔ اُس وقت اُن کی آنکھوں میں ممنونیت کی ایسی جھلک ہوتی کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک ضلع میں بزرگ شاعر کے سامنے میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُن کا ہاتھ ہوا میں رہ گیا، تب مجھے معلوم ہوا کہ انہیں ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ چار پانچ ضلع کے بزرگوں کو ایوارڈ دیے تو وہ عمر کے اُس حصے میں تھے کہ اس کے بعد بہت جلد جنت مکانی ہوگئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ عمر کے آخری حصے میں ہی سہی، میں اُن تک پہونچنے میں کامیاب تو ہوگیا۔ میرے اِس پروگرام کو پوری دنیا نے سراہا، کیونکہ اس طرح کا کام صرف بہار اردو اکادمی ہی کرتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے خصوصی اختیار کو کام میں لاتے ہوئے اُن ادبا اور شعرا اور صحافیوں کی فوری مالی مدد کی جو بہت بیمار تھے، یا کسی ادیب کی اسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملتی تو میں اُن کی بھی اکادمی کی طرف سے مالی امداد کرتا۔ میں انھیں اسپتال یا ان کے گھر جا کر بیس سے پینتیس ہزار کی رقم فوری طور پہ دیتا تاکہ انھیں علاج معالجے میں آسانی ہو۔ یہ کام بھی کوئی اکادمی نہیں کرتی تھی۔ اشتہار کی بنیاد پہ بیمار ادیبوں کی جو مالی تعاون کی جاتی وہ الگ تھی۔ افسوس میرے آنے کے بعد سے سارے کام معطل ہیں۔

● سوال: ادبی اداروں کے کلیدی عہدوں پر بعض اوقات غیر ادیب آبراجمان ہوتے ہیں؛ اس انتظامی سے ادبی سرگرمیاں کہاں تک متاثر ہوتے ہیں؟ کوئی مثال؟

جواب: ہاں ایسی مثال تو خود اردو اکادمی میں موجود رہی ہے۔ اردو سے نابلد لوگ سکریٹری اور وائس چیرمین بنادیے گئے۔ اب ان سے آپ کیا امید کر سکتے ہیں۔ ایسا کسی خاص پیروی کی وجہ سے اکثر ہوجاتا ہے۔ اکادمی اور دیگر اداروں کے عہدہ دار سیدھے وزیر اعلیٰ کے ذریعہ منتخب ہوتے ہیں، اب ان تک سب کی رسائی نہیں ہوتی۔ زیادہ صحیح لوگوں کا انتخاب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار کسی خاص وزیر یا سیاسی لیڈر کی ایما پر غیر مناسب لوگ بھی عہدیدار بنادیے جاتے ہیں۔

● سوال: آپ کے ادارے کے پاس نصاب سازی یا نصاب ساز کمیٹی سے مشاورت کا اختیار بھی ہے؟ آپ نصاب ساز کمیٹی کی تگ و دو سے مطمئن ہیں؟

جواب: نہیں! بہار اردو اکادمی کو اسکول یا کالج کی نصاب سازی سے مطلب نہیں ہے۔ یہ کام محکمہ تعلیم کا ہے۔ کالج کے نصاب میں ایسی کتابیں شامل ہیں جو کم یاب کے ساتھ نایاب بھی ہیں۔ بہار کے سبھی یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے رکن ہوتے ہیں۔ میں نے ان صدور سے میٹنگ کے دوران یہ گزارش کی کہ ہر صدر اپنی یونی ورسٹی کی نصابی کتابیں اکادمی کو مہیا فرما دیں۔ اکادمی ان کا بالکل سستا ایڈیشن شایع کرے گی اور پرنٹنگ کوسٹ میں طلبہ کو مہیا کرائے گی، لیکن میری بار بار کی یاد دہانی کے بعد کسی بھی صدر نے کوئی کتاب نہیں دی؛ جب میں نے سختی سے ضد کی تو ایک صاحب نے فرمایا کتابیں آپ خود تلاش کر لیں۔ تگ دو میں جو خرچ آئے گا وہ میں ادا کر دوں گا۔ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔ رہی بات نصاب ساز کمیٹی کی تگ و دو کی تو عرض ہے کہ بالکل اطمینان بخش نہیں ہے۔ تفصیل میں اس لیے نہیں جاؤں گا کہ بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی۔

● سوال: ادارے کا سربراہ کسی کو نواز تو سکتا ہے لیکن اگر نقصان پہنچانا چاہے تو کس قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے؟

جواب: ترقیاتی فیصلے اکیلے سربراہ نہیں کرتا بلکہ مجلس عاملہ کے فیصلے کی بنیاد پر ہوتا ہے تو ان معاملوں میں نہ تو غیر قانونی طور پر کسی کو نواز سکتا ہے اور نہ ہی کسی حق دار کا حق روک سکتا ہے۔ ہاں وہ اپنے دائرۂ اختیار کے اندر جو چاہے کرے لیکن کم ظرفی نہیں کرتا۔

● سوال: انفرادی نوعیت کے ادبی رسائل کی اکادمی مدد کرتی رہی ہے؟ یا کس طرح مدد کر سکتی ہے؟

جواب: میں دو بارا اکادمی کا سکریٹری رہا اور ہر بار اردو رسائل کی مدد کرتا رہا۔ سارے رسائل کی نہیں لیکن جن رسائل نے مدد مانگی اگر وہ بہتر ادبی نوعیت کے رہے تو میں نے پچاس ساٹھ اردو لائبریریز جنھیں میں نے مالی تعاون دیا تھا انہیں سال بھر کے لیے رسالہ جاری کر دیا۔ اس طرح رسالے کو یک مشت ساٹھ خریدار ملے۔ کچھ رسائل نے کوئی خاص نمبر نکالا اور انھوں نے تعاون کے لیے درخواست دی تو ان کے خاص نمبر اکادمی سے الحاق اردو لائبریری کو بھجوا دیے اور رقم کی ادائیگی اکادمی سے کرا دی اس کے ساتھ بہت سے اردو رسائل کے نمبرات کے لیے اشتہار بھی بھجوا دیے۔ اس طرح مختلف اشکال سے اردو رسائل کی مالی مدد کرتا رہا۔ میں پہلے ہی کہ چکا ہوں کہ یہ سب سکریٹری کے اپنے وژن پر منحصر کرتا ہے۔

● سوال: برصغیر پاک و ہند میں شاید ہی کسی علاقے میں نوآموز ادیبوں کے لیے اکیڈمیاں ہوں؟ ہمارے سرکاری ادارے اس طرف کیوں توجہ نہیں دیتے؟

جواب: اردو اکادمیاں نوآموز یا پختہ کار ادیبوں کے لیے الگ الگ نہیں ہوسکتیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہاں کے ہر صوبہ میں اردو اکادمیوں کا قیام ہے۔ کچھ نئے صوبے ایسے ضرور ہیں جہاں اکادمی نہیں ہے۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے تو یہاں اردو کے ساتھ ہندی، بھوجپوری، مگہی، بنگالی اکادمیاں کام کررہی ہیں اور سب سے فعال اردو اکادمی ہی ہے۔ جہاں تک نوآموز ادیبوں کا سوال ہے تو یہ بتا تا چلوں کہ وہ بھی اردو اکادمی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان کے مسودوں کی اشاعت کے لیے اکادمی مالی تعاون دیتی ہے اور اگر انہوں نے اپنی رقم سے کتاب شایع کروالی تو اکادمی انہیں میرٹ کی بنیاد پہ انعام بھی دیتی ہے۔ میں نے اپنے وقت میں نوآموز ادیبوں کے لیے ایک اعلان کیا تھا کہ نوآموز شاعر اکادمی کے نائب صدر جناب سلطان اختر سے اپنے کلام پہ اصلاح لے سکتے ہیں جو غزل کے سلطان کہلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے نائب صدر پروفیسر اعجاز علی ارشد سے تنقید سیکھیں اور فکشن کے لیے مجھ سے رابطہ کریں، لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ صرف ایک لڑکا مجھے ایک کہانی دے گیا وہ بھی دوبارہ نہیں آیا۔ تنقید سے کسی کو غرض نہیں تھی ہاں شاعری کے لیے ایک دو خواتین نے دفتر میں سلطان صاحب سے ضرور مشورہ کیا لیکن زیادہ شعرا صرف فون پر اصلاح کے خواہش مند تھے اور موقع بے موقع رات بہ رات انھیں فون کرکر کے پریشان کرتے۔ اگر نوآموز میں سیکھنے کی لگن ہوتو اسے راستہ مل جاتا ہے لیکن جو سرِ راہ سیکھنا چاہتے ہیں وہ کیا سیکھ پائیں گے۔ میرے وقت میں ہندی داں حضرات کو پندرہ دنوں میں اردو لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ روزانہ ایک گھنٹے کا کلاس ہوتا جس میں سرکاری ملازم سے لے کر بڑے آفیسرز تک شامل تھے اور یہ پروگرام بہت مقبول تھا۔ میں ایک فنکشن میں جب دوبئ گیا تو لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ اردو سیکھنے کا یہ پروگرام وہاں بھی کروایا جائے۔ بہار میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ بھی ادیبوں کے مسودوں پر اشاعت کے لیے رقم دی جاتی ہے اور تین مہینے میں اردو لکھنے پڑھنے کا انتظام بھی ہے جس سے زندگی کے ہر شعبے کے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔

● سوال: کیا اکادمی کی چھوٹی بڑی ملازمت ترجیحاً ادیبوں کو ملنی چاہیے؟

جواب: اکادمی اسامیوں کے لیے ادیب ہونا شرط نہیں ہوتا؛ ہاں اردو آنرز والوں کو صلاحیت کی بنیاد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ہر ادیب میں تنظیمی صلاحیت ہو یہ ضروری نہیں؛ اس لیے کمیٹی جو ضابطے طے کرتی ہے اسی کی بنیاد پر اسامیاں پُر کی جاتی ہیں۔

سوال 19: اردو اکادمی کے سربراہ کی حیثیت سے آپ نے محسوس کیا کہ اردو کے حوالے سے حکومت یا دیگر ادبی تنظیمیں یا ادبی ادارے تعصب کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟

جواب: اردو اکادمی ایک خود مختار ادارہ ضرور ہے لیکن سرکار جو گرانٹ دیتی ہے اس کا استعمال سرکاری ضابطے کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ حکومت کی جانب سے تعصب تو نہیں برتا جاتا لیکن توجہ کی کمی ضرور رہتی ہے۔ نئی کمیٹی کی تشکیل وقت پر نہیں ہونے سے اکادمی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسرے اداروں کو کوئی مطلب نہیں رہتا کہ اکادمی سبھی اردو اداروں کی مدد کرتی رہتی ہے۔

نوری صاحب! بہت نوازش۔ آپ کا انٹرویو افادۂ عام کے لیے ذوق میں شایع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر نذر عابد

غزل بنانا کھیل نہیں

اردو شاعری میں طرحی مصرعے پر غزل کہنے کی روایت خاصی توانا رہی ہے۔ عام طور پر ایسی غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہی سامنے آتے ہیں کہ شاعر کے تخیل کو پہلے ہی سے ایک لگے بندھے سانچے کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔ تاہم استثنائی صورتیں بہر حال موجود ہو سکتی ہیں۔ جیسے غالب کی وہ معروف غزل طرحی ہے، جس کا مطلع ہے:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سولہ اشعار پر مشتمل یہ خوبصورت طرحی غزل خود غالب کو اس قدر پسند تھی کہ انہوں نے یہ غزل اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کو لکھ کر بھیجی اور یوں داد چاہی:

''بھائی خدا کے واسطے اس غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے، اور وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟''

لیکن اس زمین میں کہی گئی دیگر غزلیں تاریخ اور وقت کے کوڑے دان کی نذر ہو گئیں گویا:

وقت کے ہاتھوں یہ غزلیں خود ہی پنہاں ہو گئیں۔

ویسے طرحی غزل کہنا موچی کا جوتے بنانے کا سا عمل لگتا ہے جو وہ ایک خاص سانچا سامنے رکھ کر بناتا ہے۔ شعری جفت سازی کے اس عمل میں قافیے اور ردیف کے کیل کانٹے تک کی نشان دہی کر دی جاتی ہے کہ اس سے سرِ مو انحراف ممکن نہیں۔ غزل میں قافیے ردیف کی پابندی تو شاعر فطری اور طبعی غزل کہتے ہوئے بھی کرتا ہے لیکن اس صورت میں انتخاب اس کا اپنا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں انیسویں صدی میں انگریز سرکار نے طرحی مشاعروں کا رخ غزل سے نظم کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ یہ کام مولوی محمد حسین آزاد کو گویا اپنے والد بزرگوار کو انگریزوں کی طرف سے دی جانے والی پھانسی کا غم غلط کرنے کی خاطر سونپا گیا۔ انھوں نے اس کارِ سرکار کو انجام دینے کے لیے مولانا حالی کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا کہ آخر انھیں بھی جدید اردو نظم کا بانی کہلانے کا خاصا شوق تھا۔ اصل بات شاید یہ تھی کہ جو غزل گو شاعر ایمائیت اور رمزیت کے پردے میں انگریز

سامراج پر جس انداز میں طنزیہ وار کر کے مزاحمتی رویے کو فروغ دے سکتا تھا، اسی شاعر کو برسات اور بہار کے موسموں پر نظمیں لکھنے پر لگا دیا گیا۔ یوں کچھ دیر کے لیے ہی سہی، طرحی مشاعروں کا رخ طرحی مناظموں کی طرف مڑ گیا۔

برصغیر میں غزلیہ طرحی مشاعروں کے قدردان و مربی اکثر راجے مہاراجے اور نوابین بھی ہوتے تھے۔ کہتے ہیں ایسے ہی کسی نواب صاحب کو طرحی مشاعروں کی سرپرستی کرتے کرتے خود بھی شاعری کا شوق چرایا۔ تخلیقی جوہر تو ان کی ذات میں مفقود کیا سرے سے ناپید تھا، البتہ اپنے لیے غزل فراہم کرنے کا ایسا ڈھنگ نکالا کہ شاعری پر نہ سہی، ان کی اس حکمت عملی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ طریقۂ واردات ان کا یہ تھا کہ مشاعرے سے دو چار روز قبل دس بارہ شعراء کو اپنے ہاں مدعو کرتے اور ہر شاعر کو الگ الگ کوٹھڑی میں مع سامانِ خورد و نوش اور آلاتِ قرطاس و قلم گویا قید کر دیتے۔ ہر شاعر ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق طرحی مصرعے پر مشقِ ستم فرماتا۔ یوں گھنٹے دو گھنٹے کے بعد ہر کوٹھڑی سے ایک شاعر ایک عدد طرحی غزل لے کر برآمد ہوتا۔ یہ تمام طرحی غزلیں نواب صاحب کے حضور پیش کر دی جاتیں۔ کتنا بھی گیا گزرا شاعر ہو طرحی غزل میں بھی ایک آدھ اچھا شعر نکال ہی لیتا ہے۔ دس بارہ غزلوں میں دس بارہ اچھے اشعار تو نواب صاحب کے ہتھے چڑھ ہی جاتے ہوں گے۔ یوں مشاعرے میں پیش کرنے کے لیے ان کی طرحی غزل تیار ہو جاتی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ صرف اس پر بس نہیں کرتے تھے۔ ہر شعر کے سامنے متعلقہ شاعر کا نام بھی نہایت باریکی سے لکھ لیتے تھے۔ شمع جب ان کے سامنے آتی تو ہر شعر پڑھنے سے پہلے اس شعر کے خالق کو مخاطب کر کے کہتے:

''حضور! آپ کے رنگ میں کہنے کی جسارت کی ہے، ملاحظہ فرمائیں''۔ ایسے میں شاعر داد تو کیا دیتا ہوگا، خون کے گھونٹ ضرور پی کر رہ جاتا ہوگا۔ مشاعرے کے بعد نواب صاحب دل میں ضرور سوچتے ہوں گے:

غزل بنانا کھیل نہیں ہے، بنتے بنتے بنتی ہے

احسان بن مجید

سفرنامہ، آپ بیتی اور تنقید

جب ہم ادب کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ادب بطور اکائی ہوتا ہے اور ادب دو بڑی اصناف میں تخلیق ہو رہا ہے: (1) نظم (2) نثر۔ منظوم ادب میں حمد و نعت، غزل، دوہا، ماہیا اور کئی دوسری اقسام ہیں، اس ادب کا تخلیق کار شاعر ہے جو عرصۂ تخلیق میں حقیقی دنیا سے الگ اپنی ایک دنیا بسا لیتا ہے، یہ ایسا لمحہ ہوتا ہے جب شاعر شعور کے تسلط میں ہوتا ہے اور شعور خیالات کی تھریشنگ Threshing میں مصروف، کس خیال کو شعر ہونا ہے اور کس کو نہیں، یہ فرض شعور پوری ایمان داری سے ادا کرتا ہے اور اس پر شاعر کوئی سمجھوتا نہیں کرتا۔ منتخب خیال کو شعر کرنے کے لیے الفاظ کا کارخانہ روانہ کر دیا جاتا ہے، جہاں سے خیال جس صورت میں برآمد ہوتا ہے وہ قارئین و سامعین سے آہ یا واہ وصول کرتا ہے، شعور کے ہاں صرف شاعری کے متعلق خیال نہیں ہوتے بلکہ عام زندگی، طرب و کرب کی سوچیں بھی شعور کی راہداری سے گزرتی ہیں لیکن شعور ایک ایسا مطلق العنان حاکم ہے جو کسی بھی خیال کو جلد یا بہ دیر قبول کر کے اسے سنوارنے پر قادر ہے، یہی وہ لمحہ اور مرحلہ ہوتا ہے جو شاعر کو تکمیلِ تخلیق تک الجھن میں مبتلا رکھتا ہے، عام تاثر یہ ہے کہ شاعر اٹھتے بیٹھتے شعر کہہ لیتا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ شاعر ایک منظم تخلیقی عمل سے گزر کر سرخرو ہوتا ہے۔ اردو ادب کی دوسری اور اہم صنف نثر ہے، منثور ادب میں افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں لیکن سفرنامہ اور آپ بیتی Biography کو بھی نثری ادب میں شامل سمجھا گیا یا کر لیا گیا۔ جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے اس میں بھی شاعری کی طرح ایک خیالی عمارت ایستادہ کی جاتی ہے، معروف افسانہ نگار وقار بن الٰہی اردو افسانے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں" خیال اپنی پوری ہیئت کے ساتھ وارد ہوتا ہے"۔ افسانے کا جزوِ لاینفک کہانی ہے۔ یوں افسانہ نگار شعوری طور پر کہانی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے، بعض اوقات اسے چند اکٹھی کہانیاں شعور کی دہلیز پر منتظر ملتی ہیں

یوں جیسے چند سہیلیاں پارلر میں اپنے سنگھار کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔شعور ہر کہانی کا ناک نقشہ دیکھتا ہے، اس کا ماحول دیکھنے کے لیے اس کی چار دیواری پھلانگتا ہے، اس کے کرداروں سے ملتا ہے، ان سے مکالمہ کرتا ہے۔اس سارے عمل کے بعد کہانی کو سنگھار غرفہ بھیج دیا جاتا ہے جہاں اسے افسانہ بنانے کے Process سے گزارا جاتا ہے، یہاں شعور اپنے وظیفے کا اختتام کرتے ہوئے افسانہ نگار کے حوالے کر دیتا ہے جو افسانے کو اپنے اسلوب کی رِدا تلے لاتے ہوئے کرداروں سے ہم کلام ہونے کے بعد افسانے کو ایک نام دیتا ہے۔ یہ نام ہی افسانے کا نام ہوتا ہے۔ افسانہ تخلیق کرتے ہوئے شعور کو زیادہ اینٹ گارہ ڈھونا پڑتا ہے۔ اردو ادب کی یہ دونوں اصناف (نظم ونثر) خالصتاً "تخلیق ہیں۔ جب کہ" سفر نامہ" وہ تحریر ہے جس میں صاحبِ کتاب گھر سے سفر پر روانہ ہو کر گھر واپس لوٹنے تک کی رُوداد قلم بند کرتا ہے۔ بود و باش، رویے، اقوام، تہوار، خورد و نوش حتیٰ کہ جو کچھ بھی حیطہ ٔتحریر میں آ سکتا تھا لکھ کر کتاب، ایک ضخیم کتاب مرتب کرتا ہے۔سفر نامے میں سب مشاہداتی تاثرات ہیں، آنکھوں دیکھا، کانوں سنی باتوں پر مشتمل ایک کتھا۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ سفر نامہ لکھ کر صاحبِ کتاب نے تخلیق کی کون سی خدمت کی۔ بہت سے سفر نامے لکھے گئے، جو مقبول بھی ہُوئے، قارئین نے مصنف کو سراہا بھی، ایوارڈ سے بھی نوازے گئے ہوں گے لیکن ادب کی کسوٹی یہاں خاموش ہو جاتی ہے۔یہی حال آپ بیتی کا ہے۔ کسی ایک نے یہ قدم اٹھایا اور اب تک کئی ایسے قدم اٹھ چکے ہیں۔ آپ بیتی میں بھی تخلیق کا کوئی پہلُو نمایاں نہیں ہے۔ یہ صرف لکھاری کے تعارف اور اس پر گزرے ہوئے حالات و واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ سچ کہا جائے تو تنقید بھی تخلیق کے تابع ہے۔ فی الاصل تنقید کا وظیفہ فن پارے کے عیوب و محاسن پر بحث کرنا ہے لیکن عصرِ حاضر کے نقاد نے یہ کام ترک کر کے مضمون نویسی اپنا لی ہے۔ نقاد دورانِ تنقید اگر کسی فن پارے پر گفتگو کرتا ہے تو وہ اس کا تخلیقی عمل نہیں ہوتا۔ ادب کسی زبان کا بھی ہو جب تک اس میں شعوری مشقت شامل نہیں ہوگی وہ سطریں کہلائے گا یوں سفر نامہ، آپ بیتی اور تنقید کسی طرح ادبی اصناف نہیں ہیں۔

سید تحسین گیلانی۔ساہیوال

جدید اردو ادب فکشن، بیانے اور ثقافتی مکانیت

ہم ادب کیوں تخلیق کرتے ہیں؟ محاصل ادب کیا ہے؟ یہ سوال اہم ترین ہے۔ادب چاہے علامتی ہو مجرد یا راست، جواہر بطون تک رسائی اہم ترین ہے۔اگر ہم ایسا نہیں کر پاتے تو شاید ہم منصبِ تخلیقیت سے بہرہ ور نہ ہو پائے۔افلاطون نے کہا تھا کہ: "ادب پرچھائیں کی پرچھائیں یعنی نقل کی نقل ہے"۔یوں غالباً وہ" جوہر" اور" موجود" میں حدِ فاضل قائم کرتا ہے۔لیکن ارسطو کچھ اور کہتا ہے کہ:" جوہر موجود کے بطون میں پنہاں ہے اور سارا تغیر اس جوہر کے کھلنے اور تکمیل پانے ہی کا ایک خارجی مظہر ہے"

ڈاکٹر وزیر آغا نے ارسطو کی بات کی وضاحت میں اپنے کسی اداریے میں لکھا ہے کہ:" ارسطو نے جوہر اور موجود کی ثنویت یا دوئی کو تسلیم کیا مگر ان کے ربط باہم کو ایک نئی صورت عطا کر دی۔"

میں عرض کرنا چاہوں گا کہ اصل میں ساری باتیں سمجھنے سے متعلق ہیں۔سوشل میڈیا ہو یا کتاب ہمیں مل کر سوچنا ہوگا۔

مزید سوال سر اٹھاتے ہیں جن کے جوابات کے حصول کی سعی ہم کریں گے۔

حقیقت کیا ہے؟ علامت کیا ہے؟ تشکیلی حقیقت کیا ہے؟ مابعد جدیدی حقیقت یا تصورِ حقیقت کیا ہے؟ بیانیہ Narrative۔ثقافتی ماڈل بیانیہ حقیقت کا بیانیہ، مہا بیانیہ کیا ہے؟ ثقافتی اجارہ داری cultural hegemony کیا ہے؟

اب چونکہ ادیب معاشرے کا اعلیٰ ترین طبقہ ہوتا ہے تو دیگر طبقات کی ترجیحات سیاسی/ معاشی ہوتی ہیں یعنی ان کے مقاصد کا حصول۔لیکن ادیب کے پیشِ نظر تخلیق ادب کے سوا اور کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں اگر ادیب بھی سیاسی و مالی منفعت کے لیے اسی سطح پر اسے غیر ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے تو" دیدہء بینائے قوم" کی حیثیت کیسے برقرار رہے گی؟

ادب تو بنیادی طور پر خالص اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے اور اس کے خالق کو بلا جبر و اختلاف اپنا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ یاد رہے تخلیقِ ادب کے مقدس لمحے میں سیاحتِ باطن کا موقعہ ملنا اور پھر اس تجربے کو فن کے لبادے میں پیش کرنے کی سعادت ہی اصل ادب کی عمدہ مثال ہوگا۔

ایک عام شخص اور ادیب میں بڑا فرق یہ ہے کہ عام آدمی تمام عمر مروج مفاہیم کے تابع زندگی بسر کرتا ہے مگر تخلیق کاران مروج مفاہیم کی ماہیت ہی کو تبدیل کر دیتا ہے یہ بنیادی فرق ہے کہ عام شخص اپنے رسوم/ روایات/نظریات کا تابع مہمل ہے جبکہ ایک تخلیق کار ماضی سے قوت اخذ کر کے حال کی قلب ماہیت کرتا ہے۔اب ان تخلیق کاروں کو کیا کہیں جو ساری عمر اپنی زندگی کسی ازم کے تابع ہو کر بسر کرتے ہیں۔

جہاں تک علامت نگار کا تعلق ہے تو علامتی افسانہ نگار کے ہاں انکشافِ ذات بھی انکشافِ کائنات سے عبارت ہے۔ علامتی افسانہ نگار ظاہر اور باطن دونوں آنکھوں سے بیک وقت کام لیتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ:" علامت نگاری ذات کے خول میں بند ہونے کا ذریعہ ہے، اس کا مطلب معاشرے اور اجتماعی مسائل سے منقطع ہونا نہیں ہے، افسانے میں علامت نگاری کی جدید روایت ، داخلیت اور خارجیت کے متضاد عناصر کو مجتمع کر کے انسانی /ملکی/ معاشرتی اور تہذیبی نوعیت کے علامتی مفہوم کے ابلاغ کی خوشگوار روایت ہے اور اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

فرانسیسی ادب سے علامت پسندی کی تحریک کا با قاعدہ آغاز ہوا۔ جبکہ ہرمن میل ویل نے" 1851 میں دنیا کا پہلا علامتی ناول لکھا۔ ہرمن میل ویل کو ہی افسانوی ادب میں بھی زمزیت کا پیش رو قرار دیا گیا۔کافکا اور چیخوف نے اسے آگے بڑھایا۔ بیچ میں کئی اہم نام بھی آئے اردو ادب میں با قاعدہ 1950 اور 1960 کی دہائی میں علامت نگاری نے سر اٹھایا۔

عرض کروں گا کہ ادب کی صورت یہ ہے کہ اگر حقیقت نگاری یعنی Realism پر تمام تر توجہ مرکوز کر دی جائے تو تفصیل یعنی detail اتنی گنجان نظر آئے گی کہ اس کے اندر کا منطقہ اوجھل ہوتا چلا جاتا ہے میں اسی لیے بار ہا مودبانہ گزارش کرتا ہوں کہ علامت بالخصوص کچھ موضوعات میں یوں

مدد گار ثابت ہوسکتی ہے کہ وہ ظاہر کی دبازت یعنی تفصیل کو کم کرتی ہے تاکہ اس کی بنت کاری میں موجود چہرہ دکھائی دینے لگے۔ کہانی کی بین ہی تفصیلی بنت جذبات کے بوجھ سے وژن کو دھندلاتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون حقیقت اور فکشن میں لکھتے ہیں کہ:" یہ نہیں کہ حقیقت اور فکشن لازم وملزوم نہیں، وہ تو ہیں ہی ،لیکن پردہ veil ،ظاہر یعنی Appearance کو ڈھانپتا ہے...... فکشن کی بنت کاری" تیسری آنکھ" کی کارکردگی سے مترشح ہے جو ہمیشہ خود کو نئے سرے سے وجود میں لاتی ہے مشاہدے کو بین ہی قرطاس پر منتقل نہیں کرتی بلکہ معاشرے کے تلخ حقائق کو کومل کر کے تحریر میں ڈھالتی چلی جاتی ہے"۔

عرض کرتا چلوں کی اردو افسانے میں علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا۔ بلکہ علامتی افسانے کا شانہ روایتی افسانے کے شانے سے ملا ہوا ہے چنانچہ 70 کی دہائی سے قبل اردو میں اختر اورینوی (بال جبریل اور کینچلیاں)،سعادت حسن منٹو (پھندے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ)،ممتاز شیریں (میگھ ملہار)،کرشن چندر (غالیچہ،سریلی تصور) اور احمد علی (میرا کمرہ) نے متعدد کامیاب اور زندہ رہنے والے علامتی افسانے لکھ کر ثابت کیا ہے کہ حقیقت کی تہ در تہ کیفیات کو پیش کرنے کے لیے علامت ایک بے حد موثر وسیلہ ہے۔ یونہی انتظار حسین صاحب کے ایک مکالمے سے مختصر اقتباس یہاں پیش کرنا چاہوں گا:" اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ ایک خاص مدت کے بعد حقیقت نگاری سے اردو افسانہ کیوں اکتا گیا اور علامتی طرزِ اظہار ابھی تک کیوں نیا پرانا نہیں ہوا۔ وہاں تو حقیقت کی ایک سطح تھی جس کی معین حدیں ہیں ان حدوں کو چھو لیجیے،سفر پورا ہو گیا۔ مگر یہاں تو حقیقت تہ در تہ ہے اور بے انت۔ اس کا چھور ہی نہیں مل رہا جتنا سفر کروا اتنا تھوڑا،سو علامتی طرزِ اظہار میں تو بیان کی گنجائش ہی گنجائش ہے"۔

میں نے پہلے بھی کہیں عرض کیا تھا اعلیٰ ادب بنیادی طور پر علامتی ہی ہوتا ہے۔ اور میں علامتی ادب کو اعلیٰ ادب اس لیے سمجھتا ہوں کہ علامتی ادب سامنے کے معنی کے علاوہ معانی کے سلسلوں کو بھی جنبش میں لاتا ہے۔ اگر کسی تخلیق کا صرف ایک معنی ہو یا مخصوص ایک تناظر ہو تو وہ وقت کی دیوار پار نہیں

کر پاتی اور بہت جلد متحجر بن ہو جاتی ہے۔اس لیے علامتی ادب کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ وہ ادب جس نے صرف اپنے زمانے کی عکاسی کی اور ایک معنی کو جنم دیا، وقت کا ساتھ نہ دے سکا، اب کِرم خوردہ کتابوں میں مقید پڑا ہے، مگر علامتی ادب کی یہ خوبی ہے کہ اس کے اندر سے ہمہ وقت نئی معنوی تہیں برآمد ہوتی ہیں۔

جب کوئی بھی شے صرف ایک معنی کی حامل ہو تو اسے نشان کہا جائے گا۔ جب یہی شے ایک اور شے سے مشابہت کی بنا پر رشتہ قائم کرے تو یہ تشبیہ یا استعارہ ہے اور جب یہی شے آگے بڑھ کر معنیاتی توسیع کی علمبردار ہو جائے تو علامت ہے لیکن یاد رہے علامت محض افقی توسیع کی حامل نہیں وہ دیگر ابعاد میں بھی دخیل ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ایک تمثیل سے کچھ یوں واضح کیا ہے کہ: " فرض کیجیے آپ کسی جگہ ایک قمقمے کے پاس کھڑے ہیں تو آپ کے جسم سے محض ایک سایہ (معنی) برآمد ہوگا لیکن اگر آپ متعدد قمقموں کے قریب کھڑے ہیں تو ان قمقموں کی تعداد کے مطابق ہی آپ کے جسم سے بھی متعدد سائے (معنی) برآمد ہوں گے۔ یہی حال علامت کا ہے زندگی کے مختلف مظاہر کی چھاپ پڑنے سے علامت کے سائے (معنی) بھی تعداد میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔"

علامت اور حقیقت کے بعد ہم ایک نظر تشکیلی حقیقت پر ڈالتے ہیں جسے ہائپر ریلٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اسے مابعد جدیدی حقیقت یا تصورِ حقیقت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت کی دنیا جس تصور کو دکھاتی ہے وہ تشکیلی حقیقتوں سے منطبق ہے۔

حقیقت کیا ہے۔ حقیقت ہے بھی اور نہیں بھی، اسے نقل کی نقل بھی کہا گیا ہے۔ تشکیلی حقیقت کو حقیقت کا پیراڈوکس کہا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو ہے تو یہ نقل لیکن ان کے اثرات حقیقت سے زیادہ تیز تر ہوتے ہیں۔

عموماً ثقافتی علامتیں حقیقت کو پریزنٹ کرتی ہیں لیکن اصلاً وہ حقیقت کی واضح تصویر کے بجائے تشکیلی حقیقت سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ چنانچہ منطقی و مشاہداتی سطح پر کارگر ثابت نہ بھی ہو تشکیلی حقیقت وہی ہے جسے حقیقت تسلیم کر لیا جائے۔ ہاں اس کا اثر دیرپا اور شدید ہوتا ہے اور حقیقی بھی

۔ جو سماجی لین دین، ابلاغ و ترسیل کو پوری طرح ممکن بنائے وہ حقیقت ۔ اس اعتبار سے تمام ادب اور فنون تشکیلی حقیقتیں ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیئر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ: "مابعد جدید انسان اسی تشکیلی حقیقت میں جیے جانے پر مجبور ہے وہ اشیاء کی " اصل " سے دور اور ان کے علامتی ثقافتی تصوارات کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے''۔ یعنی عملی مفہوم میں تشکیلی حقیقت، ایک طرف صارفیت سے متاثر و متعلق ہے اور دوسری جانب تمام شبیہیں، امیجز ، ٹی وی پروگرام ، کمپیوٹر کھیلوں اور پروگراموں اور سہ ابعادی تصویروں یا ہولوگرافی سے متعلق ہے جو موجودہ عالم گیر کلچر کی شناخت ہے۔

بیانیہ یا حقیقت کا بیانیہ یا ماڈل حقیقت کا بیانیہ یہ سب بے دھڑک برتی جانے والی مابعد جدید اصطلاحیں ہیں۔ جو مابعد جدیدیت کی دین ہے۔ نشانیاتی نظام کی دریافت سے پہلے بیانیہ ناول افسانے ڈرامے کے لیے مخصوص تھا لیکن ثقافتی لسانی کروٹوں اور دریافتوں کے بعد بیانیے کا منظری تصور قدرے بدلا لیکن معنوی حیثیت میں اسے " کہانی کا بیان " ہی متصور کہا جاتا ہے۔

بیانیہ انسانی تجربات و مشاہدات کو زمانیت سے جوڑتا ہے اور ہمیں ادراک دیتا ہے کہ انسانی تجربات و مشاہدات کسی خاص لمحے میں وارد ہوتے ہیں، وہی لمحہ اپنی مکانیت کی تمام تر طاقت کے ساتھ تجربے کا حصہ بنتا ہے اور تجربے کو متشکل کرتا ہے۔

بیانیہ انسانی تجربات ٹوٹے پھوٹے اجزا کو ترتیب دے کر ایک حقیقی ماڈل مرتسم کرتا ہے۔ بیانیہ ماڈل اصلا سوچنے سمجھنے کا ایک جداگانہ طریق بھی ہے جو عمومیت کو رد کر کے لسانی تشکیل میں مددگار ہوتا ہے اور اشیا کی جسمیت اور انفرادیت کو گرفت میں لیتا ہے۔ بیانیہ بیک وقت تخلیقی اور ابلاغی قوت کا حامل ہوتا ہے۔ بیانیہ ادب کا جزو لاینفک ہے جو مختلف ثقافتوں مختلف زمانوں میں بدلتا ہے، بنیادی نہیں بلکہ بلائی سطح پر۔

حقیقت کا بیانیہ ماڈل حقیقت کے فلسفیانہ ماڈل سے مختلف ہے۔

بیانیہ ماڈل، سائنسی ماڈل سے بھی مختلف ہے۔ بیانیہ افسانوی شکل میں ذہنوں کو وسعت دیتا ہے

۔ یہ فکری تجربات کے لیے موقع اور میدان مہیا کرتا ہے۔

ایک نظر ثقافتی اجارہ داری پر مارکسی تصور کے مطابق آئیڈیالوجی کو پیدا کیا جاتا ہے۔ آئیڈیالوجی کے اسی تصور کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ثقافتی اجارہ داری کی اصطلاح متعارف کروائی گئی۔ بلاشبہ ریاست مختلف ذرائع تنظیموں اور اداروں کے ذریعے مخصوص ذہنیت اور مزاج کے لوگ پیدا کرتی ہے۔ ثقافتی اجارہ داری کا اثر و عمل وہی ہے جو آئیڈیالوجی کا ہے۔ فلسفہ انفرادی ہو سکتا ہے لیکن آئیڈیالوجی نہیں۔ آئیڈیالوجی کے ذریعے ہم اپنی اور کائنات کی تفہیم کرتے ہیں۔

میٹانریٹو یا مہابیانیہ:

لیوتار کے مطابق جدیدیت نے متعدد مہابیانے تشکیل دیے۔ مثلاً ڈارون کے نظریہ ارتقا کو انسانی نوعی ارتقا کا کلی نظریہ سمجھنا، فرائیڈ کے نفسی ماڈل کو کلی انسانی ماڈل ٹھہرانا۔

ہر مہابیانیہ، بیانیے کی حقیقی نہاد کے مطابق انسانی تجربے کو زمانیت سے تو منسلک کرتا ہے مگر خاص لمحے اور خاص صورتِ حال میں تشکیل پانے والے تجربے کو آفاقی اور لازمی قرار دیتا ہے۔

کلیت اور آفاقیت ہر مہابیانیے کی خصوصیت ہے۔ مہابیانیہ رجائی اور بسا اوقات یوٹوپیائی جہت رکھتا ہے۔

مہابیانیہ نہ صرف صداقت کا مخصوص متن پیش کرتا ہے بلکہ جائز اور معقول بھی ثابت کرتا ہے۔ بیانیہ ہو یا مہابیانیہ فکشن اور حقیقت ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اور انسانی دماغ ہمیشہ تمام ٹولز کی مدد سے ثقافتی مکانیت میں رہتے ہوئے علامت حقیقت سے متصل ہو کر ہی تمام تر بیانے تشکیل دینے پر قادر ہے۔ یوں پردہ، ظاہر اور فکشن تینوں ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

پروفیسر محمد صغیر آسی
پرنسپل گورنمنٹ کالج کلیال میر پور

اُردو زبان کا قضیۂ پیدائش

سید احتشام حسین ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' میں رقم طراز ہیں کہ یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ زبان کسے کہتے ہیں لیکن سمجھنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے ارادتاً نکالتا ہے۔

اُردو زبان کی پیدائش کا قضیہ ہزاروں برس پرانا ہے۔ اس کی صحیح تاریخ ملنا دشوار ہے۔ کسی بھی زبان یا تہذیب وثقافت کے معاملات بڑی دیر کے بعد شکل بدلتے ہیں۔ فاتح اور مفتوح قوموں کا اشتراک اکثر ایک نئی زبان کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ زبان چونکہ مادی حیثیت نہیں رکھتی کہ اس کی ضرورت کے مطابق کسی بھی شکل میں فوری طور پر تبدیل کر لیا جائے بلکہ اس کی تبدیلی صدیوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور بڑی کاوشوں و جانفشانی کے بعد کسی نئی زبان کو ادبی درجہ ملتا ہے۔ میرے استاد محترم پروفیسر سید ڈاکٹر نعیم حیدر تقوی (مرحوم) کہتے ہیں کہ ''اُردو زبان کی ابتداء اور اس کی ابتدائی نشوونما کے متعلق ماہرین لسانیات کے مختلف نظریات ہیں۔ کسی بھی زبان کی پیدائش اور مولد کے متعلق فیصلہ کرنا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ زبان کی پیدائش ایک ایسا عمل ہے جس میں کافی عرصہ لگتا ہے''۔

زبان کہاں پیدا ہوئی اور کیسے وجود میں آئی؟ یہ لسانیات کا موضوع ہے۔ اس کے لیے میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی یعنی قارئین وشوقین اُردو کو بھی ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا اور ہمیں پرانی کتابیں ڈھونڈنا ہوں گی تب جا کر کہیں کشتی کنارے لگے گی اور اس کا کھوج یا سراغ مل سکے گا۔ چونکہ ڈاکٹر گیان چند بھی یہی کہتے ہیں کہ کسی زبان کی اصل جاننے کے لیے پیچھے کی طرف منزل بہ منزل اس کی کھوج لگائی جاتی ہے۔

اب اُردو کی پیدائش گاہ کی حیثیت اُردو ادب کی تاریخ میں اختلافی قضیہ پر آ گئی ہے۔ لیکن بابائے اُردو مولوی عبدالحق اسے اُردو کی مقبولیت کا سبب قرار دیتے ہیں اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا مگر ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب ''لسانی مطالعے'' کے صفحہ نمبر

۲۲۳ پر لکھتے ہیں کہ ملک کی تقسیم نے اُردو، ہندی، ہندوستانی کا قضیہ طے کر دیا۔ نام کا جھگڑا یا قضیہ تو طے ہو گیا مگر پیدائش کا قضیہ ہنوز حل طلب ہے۔

سندھ، پنجاب، دہلی، دکن، گجرات اور متحدہ غرضیکہ ہر فریق یہی کہ رہا ہے کہ اُردو زبان اس کے ہاں پیدا ہوئی اور اپنی اپنی اس رائے کے ساتھ طویل مباحث کے علاوہ دلائل بھی دیئے ہیں۔ مثلاً پیر حسام الدین راشدی نے اپنے ایک مقالہ (اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ) مشمولہ ''اُردو'' کراچی، ۱۹۵۱۔ اپریل...... میں سندھ کو اُردو کا اولین مولد قرار دیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی (نقوش سلیمانی) میں سندھ ہی کو اس زبان کا پہلا گہوارہ کہا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اُردو) اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر (زبان و ادب مطالعہ و تحقیق) میں اُردو کی پیدائش دکن بتاتے ہیں۔ (پنجاب میں اُردو) کے مصنف حافظ محمود شیرانی اس کا مولد پنجاب بتاتے ہیں جب کہ نعیم حیدر تقوی ''تنقید و تناظر'' میں اس کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے بتاتے ہیں تو ڈاکٹر مسعود حسین نے ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اُردو زبان کا ماخذ ہریانی ہے۔ غرض برج بھاشا، کھڑی بولی، دہلوی، قنوجی، گجراتی اور گوجری سے بھی اس کا رشتہ جوڑا گیا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ ''یہیں'' پیدا ہوئی ہے۔

تاہم جب اُردو زبان کا تجزیہ کرتے ہیں تو دو باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ اُردو کا آغاز اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے اور یہاں کے مقامی باشندوں سے ان کا میل جول شروع ہوا۔

۲۔ اُردو زبان پر فارسی اور عربی کے اثرات نمایاں ہیں۔

الف) اب اہل پنجاب کا دعویٰ کہ اُردو کا بیج اس خطہ میں رچا۔

ب) اہل دہلی کا خیال کہ یہ دلی اور اس کے قرب و جوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اُردو کہلائی۔

ج) صوبہ متحدہ والوں کا بیان کہ میرٹھ اور اس کے آس پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس سے اُردو پیدا ہوئی۔

د) ایک فریق کہتا ہے کہ برج بھاشا یا سورینی بولی سے اس کا ظہور ہوا۔

(ر) اہل گجرات کا کہنا کہ یہ کچی دھات تھی، ہم نے اسے نکھارا، سنوارا اور بنایا یا پھر

(د) اہل دکن کا دعویٰ کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی اور فروغ پایا، سے محقق کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں کہ کس کو صحیح مانا جائے اور کس کو غلط۔ (تاریخ ادب اُردو) جلد اول میں ڈاکٹر

جالبی کہتے ہیں کہ زبان کا بیج جاندار تھا، زمین زرخیز تھی، نئے کلچر کی کھاد نے ایسا اثر کیا کہ تیزی سے کونپلیں پھوٹنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت بن گیا۔ ڈاکٹر موصوف آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ اس زبان کا کپڑا کس دھاگے سے بنا گیا تھا۔ یہ دھاگہ کس علاقے کی روئی سے تیار ہوا تھا؟ اور یہ روئی کس کھیت میں پیدا ہوئی تھی؟

یہ بات ماہرین لسانیات پر چھوڑ کر ہمارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ یہ سب کے منہ چڑھی زبان، جسے ہم آج اُردو کے نام سے پکارتے ہیں، جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور (عربی، ایرانی، ہندی) تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے۔

یہاں آ کر ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی یہ معاملہ ماہرین لسانیات پر چھوڑ دیا ہے مگر سندھ یونیورسٹی شعبہ اُردو کے استاد پروفیسر مرزا سلیم بیگ کہتے ہیں کہ اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق سب سے پہلے مشاہیر نے سوچا اور انہوں نے قیاس کی روشنی میں اپنی رائے قائم کی، وہ ماہرین، محققین اور مورخین کو بالترتیب، اول، دوم اور سوم سے گردانتے ہیں۔ اس کی پیدائش کا قضیہ دوامی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی (زبان اور اُردو زبان) میں کچھ نہیں بتایا، وہ کہتے ہیں کہ ”زبان ہمارے جذبات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کی بدولت انسان کو عام حیوانوں کے مقابلے میں ”حیوان ناطق“ کہا گیا ہے اور دنیا کی دوسری جاندار اور بے جان چیزوں سے بہتر و برتر سمجھا گیا ہے۔ زبان کب اور کہاں ایجاد ہوئی؟ اس کے متعلق وقت اور جگہ کا تعین بہت مشکل ہے“۔

تحقیق وتجزیہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس کے مولد کے متعلق ابھی تک کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ۔ اُردو زبان کے ارتقاء کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز آریا تہذیب کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس تحریری مواد کم ہے، اس لیے زیادہ تر آثار پر ہی انحصار کیا گیا ہے اور ان سے صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آثار اور اس کے بعد جو تحریری مواد ہم تک پہنچا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو زبان آریاؤں کی زبان سنسکرت، جس سے پراکرتیں نکلیں اور پھر ان سے اپ بھرنش نکلی جس سے بالا آخر اُردو نکلی۔

اُردو کی پیدائش اور ابتداء کے بارے میں جن عالموں اور تحقیق کرنے والوں نے مختلف خیالات ظاہر کیے ہیں، ان میں سب سے پہلا نمبر گیریرسن کا ہے۔ اس نے پاک،

بھارت کی تمام زبانوں کا تفصیل سے جائزہ لیا تھا مگر اس نے اپنی رپورٹ میں اُردو کے متعلق مختلف اور ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والی باتیں کہیں۔ کہیں کہیں وہ اسے پنجاب کے قریب بتاتا تو کہیں برج بھاشا سے۔ وہ اس زبان کی پیدائش اور ابتداء کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکا۔

زبان کے آغاز کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب ''لسانی رشتے'' کے صفحہ نمبر ۱۳ پر لکھتے ہیں کہ (واقعی زبان ہے بھی اتنی بڑی نعمت، زبان کی وجہ سے تبادلہ خیالات اور اظہار جذبات ہوتا ہے گویا سماج ہی سماج اور تہذیب کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ بالکل ابتداء میں انسان حیوانات کی طرح غوں غاں کرتا ہوگا لیکن مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے اس نے جلد ہی زبان کی تخلیق کر لی ہوگی)۔ مگر نعیم حیدر تقوی ''تنقید و تناظر'' کے صفحہ نمبر ۳۸ پر لکھتے ہیں کہ ''سب سے پہلے اشاروں میں گفتگو ہوئی ہوگی پھر کچھ صوتیات کا تعین کیا گیا ہوگا، اس طرح قدیم ترین عہد میں چند آوازوں کو چند احساسات کی علامت قرار دیا گیا''۔

اُردو کی ابتداء کب ہوئی، کہاں ہوئی اور کس طرح ہوئی؟ اُردو کیا ہے؟ کسی زبان کے سلسلے میں اس قسم کے سوالات کا شافی جواب دینا مشکل ہے۔ زبانیں فطری اور غیر محسوس طور پر معاشرتی زندگی کی ضرورتوں کے تحت وجود میں آتی ہیں، نہ کوئی خاص شخص اس کے بنانے والا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے وقت و مقام متعین ہوتے ہیں جس وقت جہاں جیسی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق خود بخود معاشرہ اپنے لیے ایک زبان پیدا کر لیتا ہے۔ پھر یہ زبان اپنے طور پر ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے اور اسے آگے بڑھاتی ہے۔ زبان کی شکل وصورت اور باطن میں زندگی کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس کا لب و لہجہ عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے۔ بہت سے الفاظ متروک و مردود ہوتے رہتے ہیں اور نئے اور جاندار لفظوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں لیکن یہ سارا عمل عوامی سطح پر انجانے طور پر ہوتا ہے۔ زبان کی تراش خرش اور حذف و اضافہ میں کسی خاص شخص یا گروہ کی حاکمیت کو دخل نہیں ہوتا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے چند الفاظ مثلاً ''پہ، کب، تلک، آوے، اور جاوے'' وغیرہ متروک کر دیئے تھے اور اپنے شاگروں کے ذریعے ایک طرح کی تحریک بھی چلائی تھی مگر یہ تحریک چونکہ زبان کے سلسلے میں غیر فطری تھی اس لیے عملاً کامیاب نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ جن مذکورہ الفاظ کو ناسخ نے متروک قرار دیا تھا،

ان میں سے متعدد الفاظ لاشعوری طور پر ناسخ کے ہی کلام میں داخل ہو گئے اور پھر ان کے تلامذہ کا بھی یہی حال ہوا۔

اُردو ہی کیا، دنیا کی ہر زبان کسی کے احکام کی تابع ہو کر نہیں بلکہ آزادانہ طور پر آگے بڑھتی ہے اس پر کسی کی اجارہ داری یا حکمرانی بھی قائم نہ رہ سکی۔ یہ آزادانہ اپنے معاشرے کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور جس معاشرے یا ماحول سے اسے سابقہ پڑتا ہے اس کی ضرورتوں کے مطابق از خود اس میں ڈھل جاتی ہے۔ کسی خاص علاقے کے لوگوں کے لب ولہجہ پر ہنسنا یا سے اپنے لہجے سے گھٹیا خیال کرنا، زبان اور اس کے مزاج سے ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم دوسروں کے لہجوں کا مذاق تو اڑاتے ہیں مگر خود یہ غور نہیں کرتے کہ ماحول کے فطری تقاضوں کے مطابق خود ہمارا لب ولہجہ کس طرح بدل رہا ہے۔ اب متعدد فقرات اور محاورات واسالیب ہیں جو مقامی زندگی کے زیر اثر اُردو میں داخل ہو کر اسے بالکل نیا رنگ وروپ دے رہے ہیں۔ زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی اور کبھی رہی بھی ہے تو اس کا دور بھی دوسری اجارہ داریوں کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔ اُردو ایک بین الاقوامی اور بین الطبقاتی مزاج کی زبان ہے۔ ابتداً اس نے عربی، فارسی اور ہندی سے بہت کچھ لیا ہے۔ برطانوی عہد میں اس نے انگریزی بان کا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اب جمہوری دور میں یہ سب سے زیادہ اثر جمہور کا قبول کرے گی۔

یہ پتہ لگانا کہ کس خاص لفظ یا زبان کی ایجاد کب اور کہاں ہوئی؟ بہت مشکل ہے پھر بھی جس طرح زندگی کے دوسرے مشکل ترین پہلوؤں پر انسان نے برابر غور وحوض کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ بالکل اسی طرح اس نے مختلف زبانوں کی جائے پیدائش، نسل، باہمی تعلق اور عہد پیدائش پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری جہاں تک اُردو کا تعلق ہے، اس کی جائے پیدائش اور عہد پیدائش کے سلسلے میں جن علمائے زبان نے کام کیا ہے انہیں دو خاص گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایک وہ جنھوں نے زبان کے ارتقاء پر مؤرخانہ نظر ڈالی ہے اور سرسری مطالعہ سے اُردو کی جنم بھومی اور عہد پیدائش کا تعین کر دیا ہے۔ (میر امن، انشا خان)

۲۔ دوسرے وہ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ زبان کے مطالعہ کے جدید اصولوں سے واقف ہیں اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، دلیل، برہان اور غور وفکر کے ساتھ لکھا ہے۔ (پروفیسر

احتشام حسین، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر سہیل بخاری، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر نصر الدین ہاشمی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری)

مگر پروفیسر مرزا اسلیم بیگ انہیں چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ا۔ ماہرین: اس میں ماہرین لسانیات شامل ہیں مثلاً ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر سہیل بخاری وغیرہ۔

۲۔ محققین: یہ ماہرین لسانیات تو نہیں ہیں تاہم انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ ان میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبد الحق، اور سید سلیمان ندوی شامل ہیں۔

۳۔ مؤرخین: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ادب یا زبان کی تاریخ لکھی ہے اور تاریخی شعور سے مباحث کی ہے۔ ان میں رام بابو سکینہ، ڈاکٹر حامد حسن قادری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اعجاز حسین فرید کوٹی اور ڈاکٹر سلیم اختر خان شامل ہیں۔

۴۔ مشاہیر: یہ وہ لوگ ہیں جن کا تحقیق و تنقید سے واسطہ نہیں ہے۔ تاہم یہ شاعر اور ادیب ضرور ہیں مگر ماہرین لسانیات نہیں ہیں۔

بقول پروفیسر موصوف کہ لسانیات سے پہلے بھی ایک طبقہ ایسا ضرور موجود تھا جو یہ سوچ رکھتا تھا۔ انہوں نے زبان کی پیدائش و ابتداء کے سلسلے میں اپنے خلوص کی روشنی میں رائے دی اور قیاس کی روشنی میں رائے دی۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد، انشاء اللہ خان اور ڈاکٹر گلکرائسٹ شامل ہیں۔

اب اس مرحلہ پر آ کر یہ چوتھے نمبر پر آنے والا طبقہ پہلے نمبر پر آ جاتا ہے اور محققین، مؤرخین اور ماہرین کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ گو کہ مذکورہ فہرست حتمی نہیں پھر بھی اس سے بہت ساری گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پہلا خاص گروہ کہتا ہے کہ

ا۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اُردو کی ابتداء عہد اکبری سے ہوئی۔

۲۔ انشا نے ''دریائے لطافت'' میں لکھا ہے کہ اُردو کی ابتداء شاہجہاں آباد سے ہوئی۔

۳۔ امام بخش صہبائی نے ''انتخاب دواوین'' میں بالکل اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔

۴۔ محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں کہ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان

اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔
۵۔عبدالغفور نساخ ''رسالہ تحقیق زبان'' میں کہتے ہیں کہ زبان اُردو روزمرہ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔
۶۔ڈاکٹر گلکرائسٹ ''ہندوستانی فلالوجی'' میں لکھتے ہیں کہ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت سے اُردو کی بنیاد قائم ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسرا خاص گروہ

ا۔گریرسن ''ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ'' میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اُردو کوئی الگ مستقبل زبان نہیں بلکہ ادبی ہندوستانی کی ایک شاخ ہے۔
۲۔حافظ محمود شیرانی ''پنجاب میں اُردو'' میں کہتے ہیں کہ اُردو کا اصل منبع پنجابی ہے۔(ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ شیرانی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں عالمانہ اور محققانہ بحثیں چھیڑی ہیں، تب سے اُردو زبان کی تحقیق کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا جو اب تک جاری ہے)۔
۳۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور کہتے ہیں کہ اُردو اور پنجاب کے مابین بھی ماں، بیٹی کا رشتہ نہیں، بہن، بہن کا رشتہ ہے۔یعنی اُردو زبان کا اصل سرچشمہ پنجابی یا کھڑی بولی نہیں بلکہ قدیم زبان ہے۔جس سے خود پنجابی اور کھڑی بولی نکلی ہیں اور جو کسی وقت سارے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔
۴۔ڈاکٹر مسعود حسین خان ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' میں اپ بھرنش کی ترقی یافتہ صورت ہریانی کو اُردو کا اصل ماخذ بتاتے ہیں۔
۵۔ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اُردو زبان کا ارتقا'' میں کہتے ہیں کہ اُردو پنجابی کے مقابلے میں پالی سے زیادہ قریب ہے۔اس لیے اُردو کا قدیم ترین اور اصل سرچشمہ پالی زبان ہے۔
۶۔علامہ سید سلیمان ندوی ''نقوس سلیمانی'' میں سندھ کو اُردو کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔
۷۔پروفیسر احتشام حسین ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' میں کہتے ہیں کہ اُردو کا اصل ماخذ کھڑی بولی ہے۔
۸۔پنڈت برج موہن وناتریہ کیفی ''کیفیہ'' میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اُردو اپنے ابتدائی دور میں شمالی اور شمالی مغربی ہندکو زبان سے سے متاثر کر رہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ رہا ہے کہ راقم کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ کسی خاص مقام یا خطے کو اُردو کا مولد ہونے کے امتیاز

سے محروم کیا جائے یا یہ طرہ ایک سے چھین کر دوسرے کی دستار میں لٹکا یا جائے۔

۹۔ڈاکٹر سہیل بخاری ''اُردو کا روپ'' میں کہتے ہیں کہ اُردو پر سب سے زیادہ اثر دراوڑی زبان کا ہے۔اور یہی دراصل اُردو کا سب سے قدیم ماخذ ہے۔

۱۰۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ''ادبی تاریخ کا خاکہ'' میں ڈاکٹر مسعود حسین خان کی رائے کے حامی ہیں تاہم

۱۱۔کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی نے ''انڈو آرین اور ہندی'' میں دہلی کے گردونواح کی کھڑی بولی کو اُردو سے قریب تر بتایا ہے۔

اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں وہ پنجابی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔آخر میں بابائے اُردو مولوی عبد الحق کے خطبات سے استفادہ کرتے ہوئے ،کہ ''بہار والے چاہیں تو وہ گجرات ودکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اُردو زبان نے ان کے ہاں جنم لیا''۔

اس بحث / قضیہ کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ جدید لسانیات سے گہری واقفیت رکھنے والے اُردو زبان کی پیدائش وابتداء کی گتھیاں ہی سلجھائیں گے۔

خاور اعجاز

مابعد کلاسیکی اُردو غزل کے عناصرِ خمسہ (طبقۂ دوم)

ا(نوٹ: گذشتہ شمارے میں اِس مضمون کی پہلی قسط ''قبل از جدید اردو غزل کے عناصرِ خمسہ'' کے زیرِ عنوان شائع ہُوئی تھی۔ اشاعت کے بعد احساس ہُوا کہ یہ زمانہ مابعد کلاسیکی اردو غزل کے تحت آنا چاہیے، لہٰذا اِس شمارے میں مضمون کا تسلسل نئے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے)

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ادب اور سوسائٹی کے باہمی رشتوں پر زور دیا جانے لگا تھا۔ دوسری طرف سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ردِعمل میں رومانی تحریک کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ زبان و بیان، فکر و خیال اور نظریہ و اسلوب کی نمایاں تبدیلیوں کا آغاز بھی اِسی دور میں ہوتا ہے جس کی سب سے بڑی مثال اقبالؔ کی شاعری ہے۔ اقبالؔ اور اُن کے قریبی معاصرین کی اردو غزل کا جائزہ طبقۂ اول میں آنے والے شعرأ کے تحت گذشتہ شمارے میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اِس نشست میں ہم اُن شعرائے کرام سے ایک قدم آگے بڑھتے ہُوئے انیسویں صدی کی نویں دہائی میں اردو کے چند اور نمائندہ شعرأ کا ذکر کرتے ہیں جو اِس زبان کی نفاست، پاکیزگی اور وضعداری کے امین ٹھہرتے ہیں جیسے عزیزؔ لکھنوی، اصغرؔ گونڈوی، یگانہؔ چنگیزی، اثرؔ لکھنوی اور قمرؔ جلالوی۔

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی (لکھنو ۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ ۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ/ ۱۴ جنوری ۱۸۸۳ء ۔ ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء) شاگرد سید محمد کاظم جاویدؔ/ باقر علی خاں مشتاقؔ/ صفیؔ لکھنوی۔ صفیؔ نے اُن کے بارے میں کہا تھا:

تھے اور ہیں صفیؔ مِرے جتنے تلامذہ نکلے وفا شعار سب اُن میں مگر عزیزؔ

مورثِ اعلیٰ آٹھویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں ترکستان سے سید شرف الدین بلبل شاہ کے ساتھ کشمیر آئے اور عزیزؔ کے دادا نے نصیر الدین کے زمانے میں بسلسلہ تجارت کشمیر سے لکھنو ہجرت کی۔ اُن کے والد صاحبِ تصنیف تھے۔ عزیزؔ نے ابتدائی تربیت اپنے والدین سے پائی، پھر ختمِ قرآن کے بعد صرف ونحو، فقہ و اصول اور ادبیات و معقولات نیز تصوف کی تعلیم لکھنو کے مشاہیر سے حاصل کی۔ عربی میں کثیر المطالعہ تھے۔ معاشی ضروریات کے لیے اوّل ایک انگریز کو فارسی پڑھائی پھر آغا علی ناظمؔ کے بیٹے ڈپٹی کمشنر مرزا عباس علی خاں کے معتمدِ خاص کے طور پر کام کیا۔ عباس علی کے انتقال (۱۹۱۰ء) پر امین آباد (لکھنو) کے ایک ہائی اسکول میں ۱۹۲۸ء تک اردو فارسی کے معلم رہے۔ بعد ازاں سیتا پور میں راجہ صاحب محمود آباد کے اصرار پر اُن کے صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہُوئے اور راجہ صاحب کے کتب خانہ کی دیکھ بھال بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں

ذیابطیس کے مرض نے علیل کر دیا تو محمود آباد سے لکھنو آ گئے اور وفات پائی۔ متعدد شعرا نے قطعاتِ تاریخ وفات کہے جن میں مولوی سید احمد علی خاں، یونس زیدی، محشر لکھنوی، مجروح لکھنوی اور تسکین سورونوی شامل ہیں۔ اثر لکھنوی نے مرثیہ لکھا اور اسیر سندیلوی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

عزیزؔ کی ایک بہن مرزا الطاف حسین عالمؔ لکھنوی کو منسوب تھیں۔ عزیزؔ نے تین شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ کے انتقال پر دُوسرا نکاح محمد بہارؔ لکھنوی کی چچا زاد بہن سے ہُوا لیکن اتفاق سے وہ بھی رحلت کر گئیں تو تیسری شادی کی جس سے مرزا محمد صادق تہذیبؔ لکھنوی اور مرزا محمد جعفر حیاتؔ لکھنوی پیدا ہُوئے۔ ایک بیٹی اختر سطانہ بھی شعر کہتی تھیں۔ عزیزؔ قدیم تہذیب کے دلدادہ، صوم و صلوٰۃ کے پابند، شائستہ مزاج، خوددار، دردمند، دیر آشنا، شریف النفس، صابر، قیافہ شناس اور صاحبِ تدبیر شخص تھے۔ خوش لباس اور خوش خوراک بھی تھے۔ تصنع اور بناوٹ کو ناپسند کرتے تھے۔ اہلِ تشیع ہونے کے ناتے شعیہ کانفرنس، شعیہ یتیم خانہ اور مدرستہ الواعظین سے لگاؤ تھا۔

اُنیس برس کی عمر سے ہی اُستادانہ شعر کہنے لگے تھے اور بیس پچیس برس کی عمر میں اصلاح بھی دینے لگے تھے۔ طبیعت متنوع اصنافِ سخن کی طرف راغب تھی لہٰذا بہت سی اصنافِ نظم کے علاوہ نثر (تاریخ، تنقید، سوانح ،لغت) میں بھی قابلِ لحاظ ادبی ذخیرہ چھوڑا۔ غزل اور قصیدے کی جانب زیادہ مائل تھے۔ اُنھیں اُردو کی ترقی یافتہ شکل بنی بنائی مِلی لیکن اُنھوں نے قدیم رنگِ سخن کو ہی اپنایا۔ غزل میں مرثیہ کا رنگ لکھنو کی دین ہے لیکن یہ رنگ عزیزؔ کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ اُن کی غزل فارسی تراکیب سے مزین ہے اور دنیا کی بے ثباتی اور گردوپیش سے مایوسی کا اظہار کرتی ہے اور وہ خُود بھی ''گورِ غریباں کی سیر'' کو ترجیح دیتے تھے یعنی یہی اُن کا مزاج تھا تاہم بعض مقامات پر مشکل عربی فارسی الفاظ و محاورات ترسیلِ معنیٰ کا راستہ روک لیتے ہیں۔ تصوف کی روایت کو صفیؔ سے لے کر آگے بڑھایا اور حقیقت کے قریب رہنے کی کوشش کی۔ وہ لکھنوی مذاقِ سخن سے شاکی تھے:

عزیزؔ افسردہ ہُوں طرزِ سخن سے　　　بہت عامی مذاقِ لکھنو ہے

اِس لیے اُنھوں نے لکھنوی شاعری کے مقبول عناصر مثلاً رعایتِ لفظی، مبالغہ آرائی اور خارجی محاسن کی نسبت قلبی واردات پر توجہ مرکوز کی لیکن زبان کا ڈھانچہ لکھنوی ہی رہنے دیا۔ اس ردوبدل نے عزیزؔ کے ہاں تغزل کے مقابلتاً نئے رنگ کو پنپنے کا موقع فراہم کیا جو لکھنو کی زبان اور دِلّی کے قلبیہ سوز وساز کا مرقع قرار دیا جا سکتا ہے جس میں چشم و دل کی لطافتیں یکجا ہوگئی ہیں البتہ اُن کے ہاں بے ثباتیِ دُنیا کا موضوع بہت نمایاں ہے جو کبھی موت، کبھی گورِ غریباں اور کبھی مرقد کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اُن کا مزاج غم پسندانہ تھا، ہوسکتا ہے یہی اُن کی جوانی کی موت کا سبب بنا ہو:

شبِ غم نزع کی بھی سختیوں کا کرلیں اندازہ　　　نکل اے آہ یوں سینے سے جیسے دَم نکلتا ہے

عزیزؔ نے الفاظ کی شان وشوکت کو بھی ملحوظ رکھا لیکن اِس ظاہری لباس کے اندر موجود معنی کی شخصیت پر لباس کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ اِس احتیاط نے اُن کے شاعری میں ایسے لطیف اشارے بھر دیے ہیں جو ذرا

توقف سے سمجھ آتے ہیں۔

عزیزؔ کے ہاں شبلی اور سلیمان ندوی سے تنقیدی شعور اور اکبرؔ الہ آبادی اور اقبالؔ سے فلسفیانہ خیال آرائی اور قومی جذبہ کی کارفرمائی در آئی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ سے مرعوب تھے اسی لیے اُنھوں نے لکھنوی ہوتے ہُوئے بھی دہلوی طرزِ سخن اور غالبؔ کے رنگ کو ترجیح دی اور بعض مقامات پر تو غالبؔ کا صریح چربہ بھی کیا۔ کئی مصرعوں میں غالبؔ کے مصرعوں کی گونج ہی نہیں، مستعار معلوم ہوتے ہیں مثلاً

عزیز	غالب
حاصل جہاں سے کیجیے، عبرت ہی کیوں نہ ہو	حاصل نہ کیجیے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

انتخابِ کلام

زبان دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی
کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا

ہمارے چہرے سے کیا کچھ عیاں نہیں ہوتا
تم آپ دیکھ لو ہم سے بیاں نہیں ہوتا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھُولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہُوا
خیر گذری کہ تُو خُدا نہ ہُوا

نیا نیا جو کسی شوخ کو شباب آیا
اُٹھا کے آئینہ دیکھا تو خود حجاب آیا

دل سینہ میں جب تک رہا آرام نہ آیا
کام آئے گا کس کے جو مِرے کام نہ آیا

شمع جل کر رہ گئی پروانہ بجھ کر رہ گیا
یادگارِ حسن وعشق اک داغ دل پر رہ گیا

ہم تو دل ہی پر سمجھتے تھے بتوں کا اختیار
نصب کعبہ میں بھی اَب تک ایک پتھر رہ گیا

کوثر کی موج کہتے ہیں جس کو جنابِ شیخ
بت بھی نکال دیں گے اسی آستیں سے ہم

مصیبت تھی ہمارے ہی لیے کیوں
یہ مانا ہم جیے لیکن جیے کیوں

ہر چند ضبط باعثِ اخفائے راز ہو
یہ بات اَب نہیں ہے مِرے اختیار میں

یہ زندگی بھی یاد رہے گی زمانے میں
مَیں ہُوں قفس میں روح مِری آشیانے میں

کسی سے تیرے سوا خواہشِ کلام نہیں
جو تُو نہیں تو زباں کو سخن سے کام نہیں

مریضِ ہجر میں اَب کیا رہا جو پُوچھتے ہو
یہ حال ہے کہ اگر صبح ہے تو شام نہیں

کوئی مریضِ غم کا دمِ واپسیں نہیں
اِک جان ہے سو وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں

صرف اِک نظر فریبیِ وہم و خیال ہے
کیا ہستیِ طلسمِ جہاں جب ہمیں نہیں

قفس میں جی نہیں لگتا ہے آہ پھر بھی مِرا
یہ جانتا ہُوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں

جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا
ہم سے تو کوئی بولتا ہی نہیں

ظلم کرتے ہیں یہ ظالم کہ دوا کرتے ہیں
چارہ سازوں سے یہ پوچھو تو کہ کیا کرتے ہیں

بیکار یہ غصّہ ہے کیوں اُس کی طرف دیکھو
آئینے کی ہستی کیا، تم اپنی طرف دیکھو

محدود ہے نظارہ جب ہیں یہی دو عالم
یا اپنی طرف دیکھو یا میری طرف دیکھو

دامِ وحشت میں کوئی یوں بھی گرفتار نہ ہو
دَم الجھتا ہے گریباں میں اگر تار نہ ہو

آج صیّاد نے فرمانِ رہائی تو دیا
مگر اُن کو کہ جنہیں طاقتِ پرواز نہ ہو

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیزؔ
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

جب اپنے کام سے فارغ نگاہِ شرمگیں ہوگی
خدا جانے یہ دُنیا پھر بھی ہوگی یا نہیں ہوگی

اُٹھ کے پہلو سے چلے جائیں گے وہ
دل سے ہم سے گفتگو رہ جائے گی

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہُوئی

دُوسرے کی انتہا وابستۂ تخئیل ہے
اِک سرا تو ہے ہمارے پاؤں میں زنجیر کا

اچھا کِیا نہ آئے تم نزع میں سرھانے
جینا تو خیر جینا مرنا محال ہوتا

آئے نہ وقتِ نزع ، مِرا دَم نکل گیا
کہنے کو بات رہ گئی اور وقت ٹل گیا

عالمِ گورِ غریباں کیا معما ہے خدا !
کس سے پوچھوں حال سارا شہر ہے سویا ہُوا

صورت کا تغیر ہے فقط فرقِ مجازی
جو دید کا طالب ہے وہی پردہ نشیں تھا

تیرگی شامِ لحد کی ہے بھیانک لیکن
ہے یہ اُترا ہُوا جامہ شبِ تنہائی کا

محروم ہُوں وصال سے گو بار یاب ہُوں
خلوت نشینِ ناز ہے وہ مَیں حجاب ہُوں

باہم آئینِ وفا رسمِ محبت کیسی
وقت اَب وہ ہے کہ بندوں کو خدا یاد نہیں

نزع کا وقت ہے بیٹھا ہے سرھانے کوئی
وقت اَب وہ ہے کہ مرنا ہمیں منظور نہیں

تلاشِ رہ نما میں کوششیں ہیں رائگاں میری
وہی ہے حدِ منزل سانس رُک جائے جہاں میری

کر چکے برباد دل کو فکر کیا انجام کی
اَب ہمیں دے دو یہ مٹی ہے ہمارے کام کی

نام ہی کو فقط حیات رہی
اَب نہ وہ دن رہے نہ رات رہی

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی جو ایک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغلِ گریہ ہمیشہ رہا عزیزؔ
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

آپ جس دل سے گریزاں تھے اُسی دل سے مِلے
دیکھیے ڈھونڈ نکالا ہے کہاں سے مَیں نے

جلوۂ رُخ سے منور تھا شبستانِ جمال
شمعیں دو اور جلا دیں تِری انگڑائی نے

میرے دل میں کوئی ہم راز اور ہے
سُن رہا ہُوں ایک آواز اور ہے

سازِ نیرنگِ جہاں بھی کیا انوکھا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

کھُلتا ہی نہیں فریبِ ہستی
کچھ بھی نہیں اور کیا نہیں ہے

خاک زندہ رہ سکیں یہ سختیاں جھیلے ہُوئے
مِل گئے مٹی میں اپنے ساتھ کے کھیلے ہُوئے

سید اصغر حسین اصغر گونڈوی (گونڈہ، ضلع گورکھ پور ۴ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ ۔ ۱۷ رمضان ۱۳۵۵ھ)

رکیم مارچ ۱۸۸۴ء۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء الہ آباد) شاگرد وحیدؔ بلگرامی رتسلیم لکھنوی۔اصل وطن ضلع گورکھ پور میں تھا لیکن مستقل قیام گونڈہ میں رہا۔ خانگی مسائل اور نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم کوئی خاص نہ ہوسکی۔عربی فارسی گھر میں والد سے پڑھی اور انگریزی تعلیم آٹھویں جماعت سے آگے نہ جاسکی کیونکہ والد کے کہنے پر تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنا پڑی اور ریلوے میں بیس روپے ماہوار پر ٹائم کیپر ہو گئے تاہم ذاتی مطالعے اور محنت سے اپنی علمی استعداد میں خاصا اضافہ کیا۔اِسی ذاتی استعداد کی بنا پر رسالہ ''ہندوستانی'' کے شعبہ اُردُو کے مدیر مقرر ہُوئے۔محکمہ ریلوے میں کام کرنے کے علاوہ ادبی مرکز لاہور، انڈین پریس الہ آباد میں اور جگرؔ مرادآبادی کی ایما پر چشموں کا کاروبار اختیار کیا۔فیض آباد سے نکلنے والے قاضی محمد حامد حسرتؔ کے ہفتہ وار ''قیصرِ ہند'' کی ابتدائی اشاعتوں کو اصغرؔ کی ترتیب وتدوین نے ہی کامیاب بنایا۔علامہ تاجورؔ نجیب آبادی کے مشورے پر اُردُو مرکز، لاہور میں بھی کام کیا۔حکیمانہ شائستگی اور قناعت پسندی اصغرؔ کی شخصیت کے نمایاں اجزا تھے۔تصوف سے خاص لگاؤ تھا ۔رہن سہن میں سلیقہ، لباس میں نفاست اور کھانے پینے میں وضعداری تھی۔خلیق، قانع، وسیع المشرب، بذلہ سنج، اور کثیر الاحباب شخص تھے۔آخر عمر میں ہندوستان اکیڈمی الہ آباد سے تعلق رہا۔یہیں اُنھوں نے ''اُردُو شاعری کی ذہنی تاریخ'' بھی لکھی۔

اصغرؔ کی نوجوانی ہر طرح سے بے راہروی میں گذری۔ بلا کے مے نوش رہے، افیون بھی کھائی اور چٹھن نامی ایک معمولی وضع قطع کی خاتون سے ملاقات بھی رہی لیکن پھر اِسی بے خودی نے اُنھیں عاجزی کی منزل پہ پہنچایا اور زندگی نے ایسا پلٹا کھایا کہ صاحبِ حال ہو کر زہد وتقویٰ، پرہیز گاری اور درویشی اختیار کی لیکن مزاج کی رنگینی اور ظریفانہ طبع قائم رہی۔ یہاں اُن کے ترکِ شراب اور چٹھن سے شادی کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ایک محفل میں ''اقبال کے اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی پر اصغرؔ سے بحث چھڑی ہُوئی تھی اور وہ حسبِ معمول اپنے اندازِ عالمانہ میں اقبالؔ کے فلسفے کے نکات بیان کر رہے تھے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے طہارتِ نفس کو شرطِ اوّلیں قرار دے رہے تھے۔ بیان کرتے کرتے اُن پر عجیب سی ماورائیت کا عالم طاری ہو گیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خوابِ گراں سے یکا یک جاگ پڑا ہو۔نگاہ کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ جائے۔اِسی اثنا میں اُن کے سامنے جامِ شراب آ گیا۔اصغرؔ نے آبدیدہ ہو کر جام اُٹھایا اور لوگوں کو مخاطب ہو کر رقت آمیز لہجہ میں کہا کہ دوستو گواہ رہنا، اصغرؔ کا یہ آخری جامِ شراب ہے، آج سے وہ مے نوشی سے توبہ کرتا ہے اور خدا اُسے معاف کرے اور اپنے عہد پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے''(۱) یوں شراب سے تو چھٹکارا ہُوا لیکن چٹھن نے، جسے اصغرؔ سے والہانہ لگاؤ تھا اور اُن سے شادی کی متمنی تھی، مسجد کے دروازے پر کھڑا ہونا شروع کر دیا جہاں اصغرؔ نماز کے لیے آتے تھے سو اِس تجویز پر کہ وہ مع خاندان کے تائب ہو جائے اصغرؔ نے اُس سے شادی کی۔

۱۹۱۷ء کے قریب شعر کہنا شروع کیے۔محدود شعری سرمائے، چلنت قسم کے مقبولِ عام شعر نہ کہنے اور مشاعرہ بازی سے پرہیز کے باعث شعرا میں ایک ممتاز اور بلند پایہ مقام رکھنے کے باجود اصغرؔ عوام الناس کے لیے اجنبی ہی رہے۔وہ ایک شائستہ کلام، نکتہ رس، طباع، نفاست پسند، حکیمانہ نظر اور عارفانہ بصیرت رکھنے والے نشاط

پرور شاعر تھے جن کے فلسفیانہ انداز میں والہانہ خلوص اور شعریت مفقود نہیں۔ اُنھوں نے ہنگامی نوعیت کی شاعری سے گریز کیا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ سے متاثر تھے اور اُن ہر دو حضرات کے اثرات اصغرؔ کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں بالخصوص اُن کے مجموعۂ کلام ''سرودِ زندگی'' کی شاعری پر اقبالؔ کے واضح اثرات ہیں لیکن اصغرؔ نے اپنی امتیازی حیثیت کو بھی برقرار رکھا۔ انتخاب کہتے تھے اور وہی لکھتے تھے جو کہنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بلند نظر شاعر تھے اور خاموشی کو اظہار پر اور بے خودی کو عقل پر ترجیح دیتے تھے اور بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی بات کرتے تھے۔ اُن کی غزل میں مضامینِ تصوّف نفاست کے ساتھ موجود ہیں۔ شعر میں شیرینی، بالغ نظری، لطافت، نفاست، متانت، سنجیدگی اور شگفتگی کے ساتھ رنگینی، موسیقیت اور رجائی انداز بھی ہے۔ فارسی الفاظ و محاورات بھی سلاست اور روانی سے کھپائے ہیں۔ اُن کی شاعری یک رنگ، ہموار اور سوز و گداز کی لپک لیے ہُوئے ہے۔ فلسفہ و حکمت اور تصوف کے مسائل و مضامین اُن کی غزل کا خاصہ ہیں جسے اُنھوں نے شاعرانہ لطافت اور دلآویزی کے ساتھ گہری نظر سے پیش کِیا ہے۔ وہ حدیثِ شوق کہنے والے شعرا میں سے تھے۔ اُن کا عشق زندگی کے حرکی عناصر سے ترتیب پاتا ہے اور سرگرمِ سفر رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اُن کے مطابق زندگی جستجوئے مسلسل اور عملِ پیہم کا نام ہے۔ وہ ذرہ میں بیاباں اور قطرہ میں بحرِ بے پایاں کا مشاہدہ کرتے ہُوئے وصل کی لذت اور ہجر کی کلفت سے ماورا ہو جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری تو اُن کی شاعری کو ''جھاڑ پھونک کی شاعری'' کہہ کر آگے نکل گئے لیکن دیکھا جائے تو اصغرؔ کی شاعری پر یہ پھبتی سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ حزن و ملال کے شاعر نہیں۔ گریہ و اضمحلال کی بجائے اُن کے ہاں روحانی رجائیت ہے۔ بلند خیالی میں بھی وہ اپنے معاصرین میں ایک خاص درجہ کے حامل شاعر تھے جو واقعیت اور صداقتِ جذبات پر کامل یقین رکھتے تھے۔ عملی زندگی میں بھی وہ اسی نظریے پر عمل پیرا تھے لہٰذا وہ ایک صوفی محض کی بجائے عارف باعمل تصور کِیے جائیں گے۔ اصغرؔ کا ابتدائی کلام تلف ہو گیا تھا۔ اُن کے ہاں جو ذہنی پختگی کا احساس ہے اُس میں کسی قدر ہاتھ اُن کے نوجوانی کے کلام کی عدم دستیابی کا بھی ہے۔

اُن کی غزل کے مضامین پاکیزہ ہیں اور اسرارِ قدرت کو مَس کرتے ہیں۔ رفعتِ خیال میں اُن کی غزل دہلی کے رنگِ جدید کی بہترین مثالوں میں کہی جا سکتی ہے۔ بھرتی کے اشعار سے پاک تصوف اور فلسفہ نے اُن کی غزل کو مزید ارتفاع بخشا ہے جو ایک خاص طرز کی تہذیب کو غزل میں اُجاگر کرتا ہے جس کی تاثیر سے پڑھنے والا بہت جلد آگاہ ہو جاتا ہے۔ فلسفیانہ شعریت کا حامل یہ شاعر اپنے معاصرین سے بالکل جدا نظر آتا ہے۔ اُن کے مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بی اے کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

جگر مراد آبادی کو اُن سے خاص محبت تھی:

کیوں کر بہارِ شعر سے ٹپکے نہ اے جگرؔ — رنگِ کلامِ حضرتِ اصغر نظر میں ہے
یوں تو ہونے کو جگرؔ اور بھی ہیں اہلِ کمال — خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

جگر مراد آبادی

فشارِ خون کے مریض تھے۔ الٰہ آباد میں ۱۹۳۴ء میں فالج کا پہلا حملہ ہُوا۔ ۱۹۳۶ء میں دو حملے اور ہُوئے جو جان

لیوا ثابت ہُوئے اور اِسی کشمکش میں وفات پائی اور احاطۂ حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی میں آسودۂ خاک ہُوئے۔

انتخابِ کلام

راز کی جستجو میں مَرتا ہُوں
اور مَیں خُود ہُوں ایک پردۂ راز

ہجومِ شوق میں اَب کیا کہوں مَیں کیا نہ کہوں
مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہُوں تمہاری نظر کو مَیں

مجھ سے جو چاہیے وہ درسِ بصیرت لیجے
مَیں خُود آواز ہُوں میری کوئی آواز نہیں

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اَب کچھ نہ پُوچھیے کہ کہاں ہُوں کہاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمرِ رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

اُٹھاؤں پردۂ ہستی جو ہو جہاں نہ خراب
سناؤں رازِ حقیقت جو خوفِ دار نہ ہو

ہر اِک جگہ تِری برقِ نگاہ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو

تِرے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں!
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں مَیں نے جہاں رکھ دی

الٰہی کیا کِیا تُو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

ہے ایک ہی جلوہ جو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیران ہے آئینہ نگر بھی

کیا مِرے حال پہ سچ مچ اُنہیں غم تھا قاصد
تُو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی ؟

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

حیران ہے زاہد مِری مستانہ ادا سے
سو راہِ طریقت کھُلی اِک لغزشِ پا سے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مَر کے کیا کریں گے، کیا کرلیا ہے جی کے

رِند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے
مِلتی ہے اَب اُنھیں سے کچھ اپنی خبر مجھے

جب اصل اِس مجاز و حقیقت کی ایک ہے
پھر کیوں پھرا رہے ہیں ادھر سے اُدھر مجھے

لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

سو بار تِرا دامن ہاتھوں میں مِرے آیا
جب آنکھ کھُلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اے پیکرِ محبوبی مَیں کس سے تجھے پُوچھوں
جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے

جز دلِ حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں
ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

عکس کِس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں
تیری صورت میں ہے کیا جو میری صُورت میں نہیں

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں

بہت سمجھے ہُوئے ہیں شیخ راہ و رسمِ منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

اِس طرح بھی کوئی سرگشت و برباد نہ ہو
اِک فسانہ ہُوں جو کچھ یاد ہو کچھ یاد نہ ہو

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اِس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہُوئی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

جلوہ ترا اَب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہُوں مَیں بھی
کچھ فتنے اُٹھے حُسن سے کچھ حُسنِ نظر سے

مہ و انجم میں بھی انداز ہیں پیمانوں کے
شب کو در بند نہیں ہوتے ہیں میخانوں کے

یہ ننگِ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گم راہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

بنا لیتا ہے موجِ خُونِ دل سے اِک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خُود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

محو ہو کر رہ گئی جو ہے وہی راہِ طریق
جو قدم مستانہ پڑتا ہے وہی منزل میں ہے

جلوۂ حسنِ پرستش گرمیِ حسنِ نیاز
ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ مے خانے میں ہے

چلا جاتا ہُوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

شب جو وہ مہر وش مِرے گھر تھا
گھر کا سایہ تلک منور تھا

غیر بیٹھا پاس اور مجھ کو اُٹھایا بزم سے
تھا کسی کا جرم اور ثابت کسی پر ہو گیا

زبان بند ہُوئی پر نہ اُس کا نام لیا
بلا سے جان گئی دل تو ہم نے تھام لیا

کیوں سرِ شام یہ دروازہ عدو کے گھر کا
بند رہتا ہے درِ فتنہ اگر باز نہیں

جان کھونے کے سوا کیا ہنر آتا ہے مجھے
یہی آتا ہے مجھے کچھ اگر آتا ہے مجھے

تھی بوئے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ
یہ اور لے اُڑی مِری مشتِ غبار کو

اور کیا بے وفائی ہوتی ہے
اَب جفا تک تو چھوڑ دی تُو نے

میرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی (پٹنہ ۲۷ ذالحج ۱۳۰۱ھ۔ ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء۔ ۴ فروری ۱۹۵۶ء لکھنو) تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ۔ شاگرد مولوی سید علی خان بیتاب عظیم آبادی / شاد عظیم آبادی / پیارے صاحب رشید۔ تعلیم میٹرک۔ بزرگ ایران سے ہندوستان آئے۔ مٹیا برج میں شاہزادوں کے اتالیق رہے اور واجد علی شاہ کے نواسے مرزا مقیم کو انگریزی پڑھائی۔ وہاں سے بیمار ہو کر لکھنو آئے اور شادی کر کے یہیں آباد ہو رہے۔ پھر کچھ عرصہ دار الترجمہ حیدر آباد میں بطور سب رجسٹرار گذارا لیکن افسروں سے بگاڑ رکھنے پر اپنے عہدے سے سبکدوش ہُوئے۔ تقسیم کے بعد دوبارہ لکھنو آ گئے۔ وہ خود کو چنگیز خانی لڑی میں پرو کر فخر محسوس کرتے تھے۔

یگانہ روزمرہ کی زندگی میں بھی کسی سے دبتے نہ تھے، یہی روش اُن کی فنکارانہ زندگی میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ میر صاحب کا تو وہ کچھ نہ بگاڑ سکے البتہ غالب سے ضرور ٹکر لی اور اس میں کچھ خود ہی زخمی ہُوئے ہوں

تو الگ بات غالبؔ کی اہمیت میں تو کوئی کمی واقع نہ ہُوئی۔ اپنے بیانِ فضیلت میں وہ لہجے کی تندی کا چنداں خیال نہ رکھتے تھے اور اختلافِ رائے کو اپنے حق کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ اپنے تئیں وہ تنگ نظروں کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے لیکن اِس عمل میں وہ خود تعصب کا شکار دِکھائی دینے لگتے تھے۔ اُنھیں اپنے نظر انداز کیے جانے کا افسوس ہی نہیں دُکھ بھی تھا اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ اُنھیں اُن کے دَور میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے لیکن اِس میں قصور سراسر اُن کا اپنا ہے کہ وہ دُوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہُوئے عدم توازن کا شکار ہو جاتے تھے۔ اِس پر طرہ یہ کہ اُنھوں نے لکھنو میں قسمت آزمائی کا ڈول ڈالا اور اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ اہلِ لکھنو نے تو میرؔ جیسے شاعر کی دال لکھنو میں نہ گلنے دی؛ یگانہؔ (مشاعرہ لوٹ کر اُٹھنے کے باوجود) اُن کے آگے کیا چیز تھے۔ پھر ہُوا یہ کہ وہ جو توقع لے کر لکھنو آئے تھے اُس پر پانی پھر گیا، لکھنو والوں سے شعر و سخن کے معاملے میں بھی بدمزگی ہو گئی اور وہ تنازعات کی زد میں آتے چلے گئے۔:

مزارِ یاسؔ پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے   دُعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنو کرتے

اِس جنگ و جدل میں اپنے اپنے مورچے کا دفاع کرتے ہُوئے طرفین میں خوب خوب گولہ باری ہُوئی۔ ایک طرف یگانہؔ تنہا تھے اور دُوسری جانب لکھنوی مزاج کا جمِ غفیر۔ مغائرت کے تند و تیز ریلوں میں یگانہؔ تنکے کی طرح بہتے رہے مگر مزاحمت کی روش ترک نہ کی۔ اُنھوں نے اپنے اندرون میں پیدا ہو جانے والے احساسِ کمتری کو بیرونی خودنمائی سے چھپانے کی کوشش کی لیکن اس ردِعمل میں اُن کے ہمزاد ''مرزا مراد بیگ شیرازی'' بھی اُن کی کچھ مدد نہ کر سکے۔ اُنھوں نے غالبؔ شکنی کی آڑ میں لکھنو کی حمایت حاصل کرتے کرتے دہلی اور باقی ادبی مراکز کی مخالفت بھی مول لے لی اور رہی سہی کسر خود کو یگانہؔ علیہ السلام اور امام الغزل کے علاوہ بھی کئی القابات سے نواز کر پوری کر لی، بلکہ وہ اِس سے بھی آگے نکل گئے اور مذہب کے ساتھ دُشمنی پال لی۔ اِس سرکشی کے ردِعمل میں لکھنو نے اُن کا ذریعۂ معاش چھینا، جیل بھجوانے کی کوشش کی، گالیاں دیں، ہجویں لکھیں، گھر پر یلغار کی اور منہ کالا کر کے جوتوں کا ہار پہنایا اور شہر میں جلوس نکالا۔ یہ سب اُس سے بہت بڑھ کر تھا جو انشاؔ اور اُن کے شاگردوں نے مصحفیؔ کے ساتھ کیا۔ مردم گزیدگی کی اِس روایت کو لکھنو کے تہذیبی بہاؤ میں دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔ دُوسری طرف یگانہؔ کی شخصیت کے شاعرانہ پہلو کے علاوہ دیگر سماجی پہلوؤں پر بھی غور کی ضرورت ہے۔ مثلاً بطور استاد یا خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے جائزہ اُن کے کردار کے بعض کم معلوم گوشوں کو اُجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

اقبالؔ کے ہم عصروں میں جہاں حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی اور اصغرؔ گونڈوی جیسے نام آتے ہیں وہاں یگانہؔ کا نام بھی یاد آتا ہے ذہین اور تیز فہم شاعر تھے۔ شعر تیکھا اور قدرے طنزیہ انداز کا لیکن استادانہ رنگ میں کہتے تھے اور محاورہ خُوب برتتے تھے۔ اُن کی غزل رونے دھونے کے عمومی رجحان سے پاک ہے۔ لطف و سرمستی کی کمی اور بعض مقامات پر محض صنعت گری کے باوجود اُن کا کلام ندرتِ بیان کے لحاظ سے اہلِ ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ طبیعت میں تعلّی کا بہت رجحان تھا۔ اُن کے پہلے مجموعے کا کلام روایتی کہا گیا ہے لیکن اِس روایتی انداز میں بھی یاسؔ

کے ہاں اچھے اشعار مِل جاتے ہیں۔ تاہم یاسؔ نے بعد میں اِس کلام کے بیشتر حصّے کو کِسی لائق نہ سمجھا۔ یاس یگانہؔ کا اکھڑ اور بدمزاج ہونا اُن کے کچھ ایسے اشعار سے بھی واضح ہے جو اُنھوں نے بعض مذہبی فرقوں، علاقوں یا اشخاص کی مخالفت میں لِکھے اور اخلاق کی بیشتر حدوں کو پار کر کے لکھے۔ تخیل کی پرواز، خیال کی گہرائی، انسانی نفسیات اور حکیمانہ تجربے کے ساتھ ساتھ یگانہؔ کا مسئلہ شاعری سے زیادہ اپنے ''حریفوں'' کو زبان دانی سے متاثر کرنا لگتا ہے۔ اُن کے کلام میں زبان کی خُوبیاں ضرور موجود ہیں لیکن لُطف سے خالی خالی۔ بعض مصرعے تو محض زبان دانی کے اِظہار کے لیے چست کیے گئے لگتے ہیں۔ کچھ اساتذۂ لکھنو کی رائے میں اُن کے کلام میں آتشؔ کی جھلک موجود ہے، ہوگی لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف وہ آتش بیانی ہے جو معاصرین کو آگ لگانے کی حد تک کہی جاسکتی ہے۔ یگانہؔ کے کلام میں اہلِ لکھنو کے عمل کا ردِعمل ہے جو شاید اُن کی طبیعت میں پہلے سے موجود تھا اور لکھنو کے قیام کے دوران اُبھر کر سامنے آ گیا۔ یگانہؔ کی تلخ زِندگی نے اُن کے روّیوں کو بھی تلخ بنادِیا تھا مگر اس کے نتیجے میں اُن کی شاعری کِسی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہُوئی بل کہ اُس میں ایک انا پرست شخص کے معاشرے سے متصادم ہونے کی آواز صاف سُنی جاسکتی ہے۔

یگانہؔ اِنفرادیت پسند تھے۔ کلاسیکی روّیوں کو ازسرِ نو مرتّب کرنے کی خواہش میں غالب شکن کہلائے لیکن دراصل وہ غالبؔ کو نہیں بل کہ اُردو غزل کے اُس کلاسیکی ستون کو گرانا چاہتے تھے جس کی بُنیاد کلاسیکی روّیوں پر رکھی ہُوئی تھی اِس لیے اُنھیں ''غالب شکن'' ہوتے ہُوئے بھی غالبؔ کا بت توڑنے میں ناکامی ہُوئی اور آخر میں وہ خود کو غالبؔ سے صلح کر لینے کا سبق بھی دیتے رہے۔ دراصل وہ نہ لکھنو اور نہ غالبؔ کا تتبع کرنا چاہتے تھے مگر اس جنگ میں انھیں یہ کامیابی ضرور ہُوئی کہ لکھنو کی خارجیت سے بچ گئے۔ اُن کی غزل میں بلندیٔ تخیل اور تیکھا پن اُن کی انانیت، مردانہ پن، توانائی اور رجائیت کا اظہار ہے۔ اُن کے اشعار کا مفہوم صاف، تراکیب غیر پیچیدہ اور مضامین بلند ہیں البتہ تغزل اور کیف و مستی کی کمی ہے تاہم یگانہؔ کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ وہ حسرتؔ، فانیؔ اور اصغرؔ سے مختلف شاعر تھے۔ حالیؔ نے غزل کی روایت کو تبدیل کیا اور یگانہؔ نے اِس کے مزاج کو۔ عشقیہ غزل کے مزاج میں جو کچھ خودداری کے عناصر شامل ہُوئے وہ یگانہؔ کے مرہونِ منت ہیں۔ یگانہؔ کی یہی خودداری اُس وقت کے کاسہ لیسوں کو گراں گذری اور غالب شکنی کی آڑ میں اُنھوں نے یگانہؔ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اپنی دانست میں تو اُنھوں نے یگانہؔ کی خوددارانہ مزاحمت کو دبانے کی پوری کوشش کی مگر انجانے میں یگانہؔ کی تحریک کو آئندہ آنے والوں کے ذہنوں میں پھیلانے کا کام سرانجام دے گئے۔

لب ولہجہ کے لحاظ سے وہ اُردو غزل کے یگانۂ روزگار شاعر ہیں۔ ان کے طرزِ گفتار میں جو مردانگی، ولولہ، جرات اور کسی قدر بلند آہنگی موجود ہے وہ اُردو غزل کے اُتنے ہی شعرا کو نصیب ہوئی ہوگی جو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ یگانہؔ ماضی کے افسوس میں گم رہنے والے شاعر نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل میں اُس قنوطیت کا احساس بہت کم ہے جو بعض اچھے شعرا کے ہاں بھی پائی جاتی ہے اور جس کا اِس کے سوا اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا کہ اپنے بارے میں ہمدردانہ جذبات کو اُبھارا جائے۔ یگانہؔ نے خود کو اِس قسم کی انفعالیت سے دُور

رکھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے عہد میں قدرے نامانوس راستے پر چلتے ہُوئے محسوس کیے گئے لیکن اُن کے ناقد شاید اِس بات سے بے خبر تھے کہ یہی تو یگانہؔ کی انفرادیت تھی جس میں انانیت کا عنصر بھی شامل تھا تاہم یگانہؔ کی خود پسندی کی حد کو چھوتی ہُوئی انانیت نے اُنھیں اپنے زمانے میں قبولِ عام کے درجہ پر فائز ہونے سے باز رکھا۔ دوسری وجہ اُن کے کلام میں رسمی عشقیہ شاعری کے باوجود مروجہ تغزل کی کمی رہی۔ تیسری وجہ غالبؔ سے ٹکرا کر خود کو پاش پاش کر لینا ہے اور چوتھی وجہ خوامخواہ کی مذہب دشمنی ہے۔

انتخابِ کلام

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیلِ راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا

یہ سب کشتِ ہوس مٹی ہے سرسبزی سے کیا حاصل
مآلِ خرمنِ حسرت ہے یاسؔ آخر کو جل جانا

ملکِ عدم کی راہ تھی، مشکل سے طے ہُوئی
منزل تک آتے آتے بدن چُور چُور تھا

پھر گئیں آنکھیں مِری کوچۂ جاناں کی طرف
شکر ہے مرتے دَم اِتنا تو مجھے ہوش رہا

چھوڑ کر جائیں کہاں اَب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

صدمے دیے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کنجِ قفس میں مَر رہے یا آشیانے میں

رُوح گھبراتی ہے جب موت کا دھیان آتا ہے
چونک چونک اُٹھتے ہیں جب خوابِ عدم دیکھتے ہیں

بجھتی ہُوئی اِک شمع ہُوں کیا دَم کا بھروسا
دشمن ہے مِری جان کی اَب آہِ سحر بھی

ساقیا، دل کی ہوس مٹ نہ سکی پیری میں
پیاس بجھتی نہیں ٹوٹے ہُوئے پیمانے سے

سیرِ چمن سے دل نہ لگاؤ، چلے چلو
فصلِ بہار پاؤں کی زنجیر ہو نہ جائے

سراپا راز ہُوں مَیں کیا بتاؤں کون ہُوں، کیا ہُوں
سمجھتا ہُوں مگر دُنیا کو سمجھانا نہیں آتا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہُوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

دُنیا مقامِ ہُو نظر آئے گی ناگہاں
ٹوٹے گا جب طلسم فریبِ نگاہ کا

دلِ بے حوصلہ تکتا ہے خریدار کی راہ
کوئی گاہک نہیں ٹوٹے ہُوئے پیمانے کا

ہَوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ مِلا

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم، گھر کا راستا نہ مِلا

ناخُدائے کم ہمّت ہاتھ پاؤں مار آیا
تہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ہار آیا

دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا
محمل نشیں تو رہ گیا محمل نہیں رہا

یاسؔ اَب تنگ آ گئے اِس ملگجی پوشاک سے
جامۂ تن دھجیاں لینے کے قابل ہو گیا

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

یاسؔ گم راہی سے اچھی زحمتِ واماندگی
ڈال لو زنجیر کوئی پائے کج رفتار میں

کیا چل سکے گی بادِ مخالف مزار میں
جلتا ہے دل جلوں کا چراغ اِس دیار میں

دیکھیے انجام کیا ہو ہستیِ موہوم کا
پڑ گیا ہے اختلاف اس خواب کی تعبیر میں

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مِل جاتے
شریکِ رنج وغم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

نہ جانے کون ہے وحدت سرائے دل میں اسیر
کہ وہم کو بھی اجازت نہیں ہے آنے کی

ہر شام ہُوئی صبح کو اِک خوابِ فراموش
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

گم ہُوئے ہوش وحواس ایسے محیطِ عشق میں
ڈوبنے والوں کو اَب تہ پر گماں ساحل کا ہے

حضرتِ مجنوں کجا ، نظّارۂ لیلیٰ کجا
ایک پردہ آنکھ کا ہے دوسرا محمل کا ہے

لبِ دریا کا ہُوا مَیں نہ تہِ دریا کا
کون سے گھاٹ یہ دھارا لیے جاتا ہے مجھے

ناخُدا کو نہیں اَب تک تہِ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

موت آئی آنے دیجیے ، پروا نہ کیجیے
منزل ہے ختم ، سجدۂ شکرانہ کیجیے

خُودی کا نشّہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خُدا بنے تھے یگانہؔ مگر بنا نہ گیا

گناہِ زندہ دِلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اَتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے ، مگر سُنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خُدا کو پہچانا
خُدا کے گھر تو کوئی بندۂ خُدا نہ گیا

چار دن کی زندگی ہے کاٹ لو ہنس کھیل کر
دل لگا لو پھر قفس ہی آشیاں ہو جائے گا

دل سی دولت ہے اگر پاس تو پھر کیا پروا
نام لکھوایئے یوسف کے خریداروں میں

دل لگانے کہ جگہ عالمِ ایجاد نہیں
خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں

فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا کی خلش
زندگی اُس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خُونِ فرہاد بر سرِ فرہاد

بدل نہ جائے زمانے کے ساتھ نیّت بھی
سنا تو ہو گا جوانی کا اعتبار نہیں

یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکرِ آسماں کیوں ہو

مزاج آپ کا دُنیا سے کچھ کشیدہ سہی
فریب کھاؤ گے پھر بھی ، فریب دیدہ سہی

فریبِ ابرِ کرم بھی بڑا سہارا ہے
بلا سے نخلِ تمنّا خزاں رسیدہ سہی

جو تیری یاد میں کھویا گیا تو کیا پروا
جدھر بھی ہو دلِ گم گشتہ ، قبلہ رُو نہ سہی

خُدا کے سامنے پاکیزگی جتانا کیا
نگاہ پاک ہو ، دل صاف ہو ، وضو نہ سہی

کس کی آواز کان میں آئی	دُور کی بات دھیان میں آئی
علم کیا ، علم کی حقیقت کیا	جیسی جس کے گمان میں آئی
بات ادھوری مگر اثر دُونا	اچھّی لکنت زبان میں آئی
مَیں پیمبر نہیں ، یگانہؔ سہی	اِس سے کیا کسر شان میں آئی
زمانہ خُدا کو خُدا جانتا ہے	یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے
بے گناہوں کو بھی پامال کیے دیتے ہو	پاؤں رکھتے ہو کہاں اور کدھر پڑتا ہے
فکرِ فردا وہ بَلا ہے کہ یگانہؔ صاحب	سوکھنے لگتا ہے دَم ، سایہ اگر پڑتا ہے

نواب میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی (لکھنو ۲۸ رمضان ۱۳۰۲ھ۔ ۲۷ صفر ۱۳۸۷ھ / ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء۔ ۶ جون ۱۹۶۷ء لکھنو) شاگرد عزیزؔ لکھنوی۔

اثرؔ ہے نام ، وطن لکھنو ، عزیز استاد	نکالتا ہُوں نئے راستے زباں کے لیے
سُن کے یہ تیری غزل خوش ہیں عزیزِ خوش نوا	عرض کر دے اے اثرؔ سب فیض ہے استاد کا

تعلیم بی اے۔ ایرانی مغل خاندان سے تعلق تھا جو طبابت کے شعبے میں خاصا معروف تھا اور اصفہان سے اکبر آباد وارد ہُوا تھا۔ یہ خاندان اولاً حنفی مذہب کا پیرو تھا لیکن بعد میں اثنا عشری ہو گیا۔ اثرؔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے، کہتے ہیں کہ ’’خلفائے راشدین قابلِ احترام ہیں، اُنھوں نے اسلام کی حفاظت کی اور اُنھی کی وجہ سے اسلام کی بقا ہُوئی، البتہ میں خلفائے راشدین میں حضرت علیؓ کو افضل سمجھتا ہُوں‘‘۔ (۲) اُن کی عملی مذہبیت کے بارے میں میر غلام رسول نازکی کا کہنا ہے کہ ’’گو سخت قسم کے مذہبی تھے لیکن عادت میں لا پرواہ تھے۔ نماز روزہ کی طرف صرف واجبی توجہ کی بلکہ روزہ رکھتے ہی نہیں تھے‘‘۔ (۳)

اثرؔ کے بزرگوں میں مرزا محمد سمیع ذرہؔ (عرف پھجو رہجو) اور اُن کے برادرِ اصغر مرزا رضا علی خاں آشفتہؔ معروف شعرا ہو گذرے ہیں۔ اثرؔ لکھنوی مرزا محمد سمیع کی چھٹی پشت میں تھے۔ اثرؔ کے والد مرزا افضل حسین خاں بھی موزوں طبع تھے۔ مثنوی زہرِ عشق والے نواب مرزا شوقؔ بھی اثرؔ کے قریبی عزیزوں میں تھے۔ اثرؔ نے اُردو اور فارسی کی ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد عربی، انگریزی، خوش نویسی اور شہسواری سیکھی، پھر درجہ ششم میں اسکول گئے۔ بعد ازاں بی اے کیا اور سال بھر ایم اے (انگریزی) پڑھنے کے علاوہ ایل ایل بی میں بھی داخلہ لیا۔ نوعمری میں کنکوے بازی سے شغف رہا۔

۱۹۰۷ء میں ملازمت شروع کی اور ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہُوئے۔ ۱۹۲۲ء میں بحیثیت ایگزیکٹو افسر کانپور میونسپلٹی فرائض انجام دیے۔ ۱۹۳۷ء میں کلکٹر کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۹۴۰ء میں الہ آباد کے ایڈیشنل کمشنر ہُوئے۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۵ء ریاستِ کشمیر میں وزیرِ ترقیات و داخلہ مقرر ہُوئے اور چار ماہ تک کشمیر کے قائمقام وزیرِ اعظم بھی رہے۔ ملازمت کے دوران سرکارِ انگلشیہ سے ’’خان بہادر‘‘ کا خطاب پایا اور ’’پدم بھوشن‘‘ کے علاوہ بھی متعدد اعزازات اور تمغات حاصل کیے۔

مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے باوجود انگریزی زبان کے فاضل تھے اور کئی انگریزی نظموں کو اُردو میں ڈھالا۔ وسیع مطالعے کے ساتھ تحقیق وتنقید میں بھی درک رکھتے تھے۔ بنگلہ، سنسکرت اور عربی نظموں کے اُردو تراجم بھی کیے۔ شائستہ مزاج، اخلاقِ حسنہ کا نمونہ، علم دوست اور ہنرمند شخص ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ عروض وقواعد اور زبان کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اُن جیسی ہمہ جہت شخصیت مدتوں بعد پیدا ہوتی ہے۔

لکھنو کی خشک غزل کے مقابل اثرؔ کے ہاں کیف ونشاط اور شادابی کے آثار نظر آتے ہیں جس کے باعث وہ لکھنوی تہذیب میں نئی روایت کے علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔ یہ روایت زبان و بیان کے قدیم سانچے میں صحت مند تبدیلیوں اور اضافوں سے عبارت ہے جس کو فروغ دینے میں اثرؔ لکھنوی کا بھی حصہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے سائنٹفک جمالیاتی طرزِ تنقید سے بھی اِس مشن کو آگے بڑھانے میں کردار ادا کیا جس کا اظہار اُن کے تحریری تنقیدی سرمائے کے علاوہ الفاظ ومحاورات کے غلط استعمال پر مناسب انداز میں فوراً ٹوک دینا تھا۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے ''ناسخیت'' کے طعنوں کو بھی بڑی خندہ پیشانی سے سہا۔

اُستادانہ غزل کہتے تھے۔ لکھنو کے محاورات اور روزمرہ پر عبور حاصل تھا۔ غالبؔ کے اشعار کی گونج اثرؔ کے بیشتر اشعار میں نمایاں طور پر ملتی ہے جیسے:

خوگرِ درد ہو اگر انساں — رنج میں بھی مزا ہے راحت کا

کہیں کہیں تو مومن کا عکس بھی پڑتا ہے:

دیکھ لے ایک نظر آنکھ چرانے والے — نیم جاں ہے کوئی بسمل کوئی بے جاں کوئی

وہ میرؔ سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ میرؔ پرست تھے:

اثرؔ ہے میر سے نادیدہ بیعت — نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

بعض مقامات پر تو میرؔ اُن کے حواس پر چھائے ہُوئے لگتے ہیں جیسے:

سانس بھی لے سنبھل کے اے ناداں — سخت نازک ہے رشتہ اُلفت کا

میرؔ کی حمایت میں ہنگامہ آفرینی تک سے گریز نہ کرتے۔ اُنھیں میرؔ کے خلاف کچھ سننا گوارا نہ تھا۔ اثرؔ کی غزل میں جس قدر بھی سوز وگداز ہے وہ میرؔ سے ذہنی قربت کا نتیجہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آنند نرائن ملا نے اُنھیں میرِ ثانی کہا۔

جس زمانے میں اثرؔ نے شاعری شروع کی وہ داغؔ وامیرؔ کی شاعری سے گونج رہا تھا اور فکری ندرت کے اوّلین مراحل میں تھا۔ پُرگو اور مشاق شاعر ہونے کے حوالے سے تو اثرؔ اساتذہ کی فہرست میں داخل ہیں لیکن جس فکری استغراق کی ضرورت اس عہد کی غزل کو ہو چلی تھی وہ مفقود ہے۔ اِس کمی کو اثرؔ کی نیم شوخ لیکن مذاقِ سلیم کے عین مطابق کہی گئی غزل نے پورا کیا۔ غزل کے علاوہ دوسری شعری اصناف میں بھی خاصا کلام موجود ہے۔

زندگی کے آخری چار سالوں میں بے حد علیل رہے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں فالج کا پہلا حملہ ہُوا تو بات چیت دشوار ہو گئی مگر رفتہ رفتہ بحال ہو گئی۔ فالج کے دُوسرے حملے میں چلنا پھرنا محدود ہو گیا۔ انتقال سے تین چار

روز پیشتر فالج کا تیسرا حملہ ہُوا جو مہلک ثابت ہُوا اور یوں اُردو کے مزاج آشنا کا اُردو سے دیرینہ رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا اور اُنھیں کربلائے تال کٹورا، لکھنؤ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ سخت گرمی کے باعث دو ڈھائی سو افراد شریکِ جنازہ تھے لیکن قبرستان پہنچتے پہنچتے یہ قافلہ پچاس ساٹھ تک رہ گیا۔ کمال لکھنوی اور رفیق حسین رفیقؔ نے قطعاتِ تاریخِ وفات لکھے۔

انتخاب کلام

مکیں ہے دل میں وہ اور دل ہے اِک عالم جداگانہ — کسی کو تو نظر آتا جو دُنیا میں کہیں ہوتا

ذوق کامل ہو اگر چشمِ تماشائی کا — اِک کرشمہ ہے یہ دہر اُس کی خود آرائی کا

بہت رازِ اُلفت چھپایا اثرؔ — مگر رنگ اُڑ کر بتانے لگا

جذب آنکھوں نے کیے ہیں مختلف جلوے ترے — مَیں کبھی لیلیٰ ، کبھی مجنوں ، کبھی محمل ہُوا

جب دل گدازِ عشق کی امداد سے ہُوا — جو لطف سے ، وہی تِری بیداد سے ہُوا

مژگاں سے جو دامن تک مشکل سے اثرؔ پہنچا — یہ خون کا اِک قطرہ سنتے ہیں کبھی دل تھا

حیات و مرگِ عاشق ایک مد و جزر ہے دل کا — کبھی دریا پسند آیا کبھی ساحل پسند آیا

اِک محشرِ خیال ہے اِک گلشنِ جمال — دل کو سنبھالیں یا ترے رُخ پر نظر کریں

شک نہیں کچھ تیری یکتائی میں اے پردہ نشیں — جس کو تُو مل جائے پھر اُس کا نشاں مِلتا نہیں

اُس نے کس لطف سے پوچھا کہ اثرؔ کیسے ہو — بے خودی کا ہو بُرا کہ دیا کچھ یاد نہیں

مِرے دل میں تُو ہے بسا ہُوا، مجھے ماسوا کی خبر نہیں — یہ وہ بزمِ راز و نیاز ہے کہ جہاں مِرا ابھی گذر نہیں

بجلی بنیں گے خانۂ صیاد کے لیے — تنکے بچے ہُوئے جو مِرے آشیاں کے ہیں

بہت دھندلے نظر آتے ہیں سب نقش و نشاں مجھ کو — یہ میری بے خودی لے جائے گی آخر کہاں مجھ کو

ہم بھی تو دیکھیں جاتے ہیں کتنے بہشت میں — پہلے جو بے گناہ ہیں اُن کا حساب ہو

مخفی ہیں لفظ عشق میں دونوں جہاں کے راز — کہنے کو عمر بھر کہو ، مطلب ادا نہ ہو

کون کہتا ہے کہ منصور پہ بیداد ہُوئی — آشنائے حرمِ عشق کو ہے دار سے راہ

دل کی تقلید کیے جاؤ نہ گھبراؤ اثرؔ — کام نکلے گا تمھارا اِسی دیوانے سے

زندگی کا یہی حاصل ہے فنا ہو جانا — مِل گئی خواب ہی میں خواب کی تعبیر مجھے

دستِ ساقی سے وہ لبریز مِلا جام مجھے — ڈھونڈتی پھرتی ہے خود گردشِ ایام مجھے

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی — تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے

کچھ داغِ آرزو ہیں آئینہ دارِ حسرت — آغازِ عشق یہ ہے آگے خبر نہیں ہے

نام و نشاں کی فکر نہ خواہش مکاں کی ہے — معلوم ہے مجھے جو حقیقت جہاں کی ہے

وارفتگانِ شوق کی ہے موت زندگی — جب آنکھ بند ہو گئی بیدار ہو گئے

وحشیوں کو ہوش میں لانا اگر مقصود ہے
وسعتِ محشر میں اِک صحرا اضافہ کیجیے

کھٹکتا نہ کیوں آنکھ میں باغباں کی
بلندی پہ تھا آشیانہ ہمارا

اثرؔ عرضِ حال اس سے بے سوچے سمجھے
کہا تھا کہ پہلے نظر دیکھ لینا

ایک مدت چاہیے اَب ہوش آنے کے لیے
بے خودی وہ بحر ہے جس کا ہے ساحل انتظار

یہ سچ ہے تم کو آتی ہے دوائے دردِ محرومی
یہ مانا مہرباں ہو گے، مگر اے مہرباں کب تک

سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسمِ بود و نبود
نہ تھا تو کیا تھا اثرؔ اور ہُوں تو کیا ہُوں مَیں

کیسی ہَوا چلی ہے اقلیمِ عاشقی میں
کیا کیا ہما ہمی تھی یا کچھ نہیں ہے جی میں

ہوش کس کو ہے ترے ذوقِ طلبگاری میں
خواب سب دیکھتے ہیں عالمِ بیداری میں

تُو جسے بھول گیا اُس کو زمانہ بھولا
تُو جسے یاد ہے کچھ اور اُسے یاد نہیں

اپنی ہی حسرتِ دیدار لیے پھرتی ہے
مَیں کوئی شے تھا مگر کیا، مجھے اَب یاد نہیں

مدت ہُوئی کہ دل ہے نہ صبر و قرار ہے
اِک جانِ زار ہے سو کہیں ہے کہیں نہیں

نگار خانۂ رضواں بھی ہو تو ویراں ہے
ترے خیال کا آئینہ جس مکاں میں نہیں

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے خاکساروں کو
جو آپ مٹ نہیں جاتے مٹائے جاتے ہیں

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب
غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی مسیحائی نہ ہو

اُمیدیں دل سے رخصت ہو رہی ہیں شادمانی کی
اثرؔ تعبیر مِلنے کو ہے خوابِ زندگانی کی

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گذر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی، اِدھر آئی اُدھر گئی

اَب ہاتھ مَلتے ہیں کہ دمِ عرضِ ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیسے اُتر گئی

کچھ دن کی اور کشمکشِ زیست ہے اثرؔ
اچھی بُری گذرنی تھی جیسی گذر گئی

ثنا تیری نہیں ممکن زباں سے
معانی دُور پھرتے ہیں بیاں سے

فروغِ گُل ہے مگر اشکبار شبنم ہے
کہ جلوے اس قدر اور فرصتِ نگہ کم ہے

جہاں دل ہے وہیں تیرا نشاں ہے
حقیقت یہ ہے باقی داستاں ہے

وہ دل جس میں سمائے عشق تیرا
مکاں بھی ہے تو رشکِ لامکاں ہے

بے خودی بزمِ تمنّا سے اُٹھا لائی ہے
عمر درکار ہے اَب آپ میں آنے کے لیے

بہار اَب کی یونہی مفت گذری جاتی ہے
جنوں ہے اور گریباں میں ایک تار نہیں

یہ تو نہیں کہ حال پہ میرے نظر نہیں
ہے لیکن اِس طرح کہ مجھے بھی خبر نہیں

آپ اور دعویٰ محبت کا اثرؔ
آپ کی بھی اِتنی ہمت ہو گئی

کیا حالِ دل سناؤں تُو جانتا ہے سب کچھ
کیا مدعا بتاؤں جب تُو ہی مدعا ہے

حریمِ قرب کی باتیں ہیں اور دل والے
مگر کسی سے کسی کا بیاں نہیں مِلتا

ایک شوقِ بے نہایت مرحلہ در مرحلہ منزلِ مقصود کعبہ یا صنم خانہ نہیں
محبت ہے سرمایۂ زندگانی حقیقت بس اِتنی ہے باقی کہانی
دل دردِ محبت سے جو بیگانہ رہے گا ویرانہ نہ ہونے پہ بھی ویرانہ رہے گا
مطلب جو شیخ کا ہے وہی برہمن کا ہے یوہیں سا اختلاف ہے وہ بھی کہیں کہیں
آرائشِ مژہ کے لیے کچھ تو چاہیے کیا اِک لہو کی بوند بھی اے دل نہیں رہی
ہنگامۂ ہستی کی بس اِتنی حقیقت ہے اِک موج تھی جو اُٹھ کر پھر مِل گئی دریا سے
یہیں تک بس رسائی عقل کی معلوم ہوتی ہے کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی معلوم ہوتی ہے
یقیں کی منزلیں شبہات ہی کے بعد آتی ہیں حقیقت پہلے اِک پرچھائیں سی معلوم ہوتی ہے

سیّد محمد حسین عابدی قمر جلالوی (قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ ۱۳۰۵ھ۔یکم شعبان ۱۳۸۸ھ/۱۸۸۷ء ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء کراچی) شاگرد امیرؔ مینائی ۔خلف سید غلام سجاد حسین جو خود بھی شعر کہتے تھے۔علی گڑھ کے قریب ایک تہذیبی پس منظر رکھنے والے قصبہ جلالی میں پیدا ہُوئے اور اِسی نسبت سے جلالوی کہلائے ۔آبا واجداد کا سلسلہ معروف ایرانی شخصیت سید نجیب علی ہمدانی سے مِلتا ہے۔قمرؔ جلالوی کے بزرگوں کا پیشہ سپاہ گری رہا لیکن بعد میں زمینداری کرنے لگے۔قدیم روایت کے مطابق قمرؔ جلالوی نے عربی فارسی اور اُردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی ۔ملنسار اور وضعدار انسان تھے ۔۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان آئے ۔کوئٹہ اور کراچی میں قیام رہا۔عمر کا زیادہ حصّہ غربت میں گذرا لیکن کہیں اپنی خودداری کا سودا نہیں کیا۔علی گڑھ میں بائیسکلوں کی دکان کرتے تھے سو قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں بھی یہی معاش اختیار کی لیکن علامہ رشید ترابی نے اُن کی خودداری کو دیکھتے ہُوئے اُنھیں بلا کر اپنے پاس رکھا اور ۱۹۵۹ء میں حکومتِ پاکستان سے اُن کا وظیفہ مقرر کروایا جو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تا عمر تھا، البتہ اُن کی غزلیں گانے والوں نے اُس زمانے میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں ضرور کمائے ۔آخری عمر میں یرقان کا شکار ہو گئے تھے اور یہی مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہُوا۔

درویش صفت شاعر تھے۔آٹھ برس کی عمر سے شعر موزوں کرنے لگے تھے اور چوبیس سال کی عمر میں دوسرے شعرا کو اصلاح دینے لگے تھے۔اپنی قابلیت کے بل بوتے پر تیس برس کی عمر میں ہی اُن کی شہرت قصبہ جلالی سے نکل کر علیگڑھ اور پھر ہندوستان کے دیگر شہروں تک پہنچی اور وہ ''استاد قمر جلالوی'' کے طور پر مشہور ہو گئے ۔دِلّی اور لکھنو کی مِلی جُلی زبان میں شاعری کی ۔آواز میں درد، عمدہ ترنم ،معنوی تہ داری اور محاورے پر دسترس کے باعث سننے والے اُن کے کلام سے متاثر ہوتے تھے۔اُنھوں نے اگر چہ اُردو شاعری کو کسی تازہ فکری جہت ،نئی تراکیب یا علامتوں سے روشناس نہیں کرایا لیکن اپنی برجستگی اور قادرالکلامی کے بل بوتے پر میسر ذخیرۂ الفاظ سے سہلِ ممتنع کا منفرد کیف آور منظر نامہ بنانے میں ضرور کامیاب رہے جس میں وارداتِ قلبی کے بیان نے شعریت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ٹکسالی اُردو کے آخری شاعر سمجھے جاتے تھے جن کے ہاں سادگی اپنی پوری برجستگی کے ساتھ موثر انداز میں پائی جاتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ گلوکاروں کو اُن کی غزلوں میں قبولِ عام کے قوی امکانات دکھائی

دیتے تھے اور برِ صغیر کے ممتاز گلوکاروں نے اُن کی غزلوں کو آواز مہیّا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مقطعوں میں اکثر ذو معنی مضمون باندھتے تھے۔ انھیں بھی بہت سے دوسرے شعرا کی طرح اُردو غزل پر اپنی نوازشات کا خیال تھا:

عدو کہتے ہیں اَب سہرا فصاحت کا تِرے سر ہے
قمؔر بالکل بنا دی ہے دلہن اُردو زباں تُو نے

انتخاب کلام

گنہ گاروں کا مجمع سب سے آگے ہوگا اے واعظ
تجھے دیدار بھی پہلے خُدا کا ہو نہیں سکتا

قیامت اَب جہاں ہوگی ستم تیرا بیاں ہوگا
یہاں ہوگی یہاں ہوگا، وہاں ہوگی وہاں ہوگا

قمؔر سے انتظامِ روشنی کو پُوچھنے والے
چراغوں کی ضرورت کیا ہے جب محفل میں تُو ہوگا

چمن والو قفس کی قید بے معیاد ہوتی ہے
تمھیں آؤ تو آ جانا مِرا آنا تو کیا ہو گا

بزمِ کثرت میں یہ کیوں ہوتا ہے اُن کا انتظار
پردۂ وحدت سے وہ باہر نکل آئیں گے کیا

چھوڑو وفا کا نام وفادار مر گیا
تم جس ہَوا میں ہو وہ زمانہ گزر گیا

وقت آ گیا ہے یار کے وعدے کا اے قمؔر
دیکھو تو آسمان ستاروں سے بھر گیا

آشیانے کا بتائیں کیا پتہ خانہ بدوش
چار تنکے رکھ لیے جِس شاخ پر گھر ہو گیا

جام خالی ہُوئے محفل میں ہمارے آگے
ہم بھرے بیٹھے رہے دیدۂ تر کی صورت

بہارِ گُل میں مجھے تو کہیں بھی چین نہیں
مِرے خلاف وہاں باغباں یہاں صیّاد

وہ پُوچھتے ہیں دیکھیے یہ طرفہ ستم اور
کس کس نے ستایا ہے تجھے، ایک تو ہم اور

صیّاد یہ جلے ہُوئے تنکے کہاں کے ہیں
بجلی اگر گِری ہے مِرے آشیاں سے دُور

تم کو ہم خاک نشینوں کا خیال آنے تک
شہر تو شہر بدل جائیں گے ویرانے تک

اَب نہ آوازِ جرس ہے اور نہ گردِ کارواں
یا تو منزل رہ گئی یا رہ گئے منزل سے ہم

اَب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبّت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اُتارا کرتے ہیں

جاتی ہُوئی میّت دیکھ کے بھی اللہ تم اُٹھ کر آ نہ سکے
دو چار قدم تو دُشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں

سُرمے کا تِل لگا کے رُخِ لاجواب میں
نقطہ بڑھا رہے ہو خُدا کی کتاب میں

کفن ہٹا کے وہ منھ بار بار دیکھتے ہیں
ابھی اُنھیں مِرے مرنے کا اعتبار نہیں

خیریت سُن لی گُل و غنچے کی لیکن اے صبا
یاد ہیں مجھ کو تو سب مَیں بھی کسی کو یاد ہُوں

یہ آئینے کی سازش تھی خطا کچھ بھی نہ تھی میری
تِرے منھ پر کہی تیری مِرے منھ پر کہی میری

اے قمؔر رات کو مے خانے میں اِتنا تھا ہجوم
قسمتیں کھُل گئیں ٹوٹے ہُوئے پیمانوں کی

بلا سے ہو شام کی سیاہی کہیں تو منزل مِری مِلے گی
اُدھر اندھیرے میں چل پڑوں گا جدھر مجھے روشنی مِلے گی

آہ کو سمجھے ہو کیا دِل سے اگر ہو جائے گی
وہ تو وہ اُن کے فرشتوں کو خبر ہو جائے گی

اگر وہ صبح کو آئے تو کس سے گفتگو ہو گی
کہ اے شمعِ شبِ فرقت نہ ہم ہوں گے نہ تُو ہو گی

لحد اور حشر میں یہ فرق کم پائے نہیں جاتے
یہاں دھوپ آ نہیں سکتی وہاں سائے نہیں جاتے

مریضِ محبّت اُنھی کا فسانہ سُناتا رہا دَم نِکلتے نِکلتے
مگر ذکرِ شامِ الم کا جب آیا چراغِ سحر بجھ گیا جلتے جلتے

بھلا کوئی وعدہ خلافی کی حد ہے حساب اپنے دِل میں لگا کر تو سوچو
قیامت کا دِن آ گیا رفتہ رفتہ مُلاقات کا دِن بدلتے بدلتے

خشکی و تری پر قادر ہے آسان مِری مشکل کر دے
ساحل کی طرف کشتی نہ سہی کشتی کی طرف ساحل کر دے

یہ کہو پیشِ خُدا حشر میں منشا کیا تھا
مَیں کوئی دُور کھڑا تھا جو صدا دی تم نے

یہ جفائیں تو وہی ہیں وہی بیداد بھی ہے
آپ کیا کہ کے ہمیں لائے تھے کچھ یاد بھی ہے

وہ میرا نام لِکھتے وقت روئے ہوں گے اے قاصد
یہاں آنسو گرے ہوں گے جہاں تحریر بگڑی ہے

دیدۂ بیمار میں ہے اشکِ آخر کی جھلک
اے قمر تارا نِکل آنا دلیلِ شام ہے

مسکرا کر مجھے یُوں دیکھ کے دھوکا تو نہ دو
جانتا ہُوں جو محبّت کی نظر ہوتی ہے

ہمارا آشیاں دیکھو بلندیِ فلک دیکھو
کہاں سے چار تنکے پھُونکنے کو برق آئی ہے

مِرا دِل ٹُوٹ جانے کی صدا رُسوا نہ ہو یارب
کوئی ایسے میں آوازِ شکستِ جام آ جائے

بس اَب چپکے رہو منصور کی بابت نہ کھلواؤ
محبت اِتنی بھر دیتے ہو جتنا دل نہیں ہوتا

کیا جانے کہے گا کیا آ کر ہے دَور یہاں پیمانے کا
اللہ کرے واعظ کو کبھی رستہ نہ مِلے میخانے کا

تربت سے لگا کرتا محشر سنتے ہیں کہ مِلتا کوئی نہیں
منزل ہے بڑی آبادی کی رستہ ہے بڑا ویرانے کا

مِرے واقعاتِ وفا ہیں وہ کہ جہانِ عشق سمجھ گیا
مِرا نام مصلحتاً اگر سرِ داستاں نہ ہُوا تو کیا

آنکھ کے آنسو پہ دل گھبرا گیا
خیر ہو کشتی میں پانی آ گیا

فرق کیا میرے لیے روزِ ازل اور حشر میں
جب بھی مَیں تصویر تھا اور اَب بھی مَیں تصویر ہُوں

یہ برق کوندتی پھرتی ہے کیوں زمانے میں
کوئی کمی تو نہیں میرے آشیانے میں

جلی ہُوئی سی جو یہ شاخ آ رہی ہے نظر
اِسی پہ تھے مِرے تنکے کسی زمانے میں

ہمارے خواب کی تعبیر باغباں کیا ہے
قفس کی تیلیاں دیکھی ہیں آشیانے میں

تماشہ دیکھنے دے ناخدا تلاطم کا
ابھی تو دیر ہے کشتی کے ڈوب جانے میں

بہاروں کی خبر سُن کر قفس میں رو تو دیتا ہُوں
کسی سے یہ نہیں کہتا مِرے پر کاٹ ڈالے ہیں

سوزِ دل حد سے سوا ہو اشک افشانی نہ ہو
اُس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

یہ دردِ ہجر اور اس پر سحر نہیں ہوتی
کہیں اِدھر کی تو دُنیا اُدھر نہیں ہوتی

بارِ غم اے مالکِ روزِ ازل ، مشکل سہی
جب کوئی راضی نہیں ہوتا تو میرا دل سہی

دن میں بھٹک رہے ہیں جو منزل کی راہ سے
یہ لوگ کیا کریں گے اگر رات ہو گئی

رات دن جاری رہِ ملکِ عدم ہے اور پھر
سامنا ہوتا نہیں رہ گیر کا رہ گیر سے

راستے بند کیے دیتے ہو دیوانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

افسوس ہے یہی مجھے فصلِ بہار میں
میرا چمن ہو اور مجھی کو نہ گھر مِلے

قبر میں رکھ کر عزیز و اقربا یہ کہ گئے
ہم یہیں تک ساتھ تھے آگے تِری تقدیر ہے

گوشۂ چشم سے باہر ہُوئی سرمے کی لکیر
خیر ہو میان سے تلوار نکل آئی ہے

قمؔر یہ ہجر کا دن کس طرح گذارو گے
کہ رات کے تو ستارے تھے رات ہی کے لیے

قفس کے ہو لیے ہم تو مگر اے اہلِ گلشن تم
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

صیّاد مَیں اسیر کہوں کِس سے حالِ دل
صرف ایک تُو ہے وہ بھی مِرا ہم زباں نہیں

کبھی کہا نہ کسی سے تِرے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

دبا کے قبر میں سب چل دیے دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

دعا بہار کی مانگی تو اِتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ مِلی میرے آشیانے کو

ضبط کرتا ہُوں تو گھُٹتا ہے قفس میں مِرا دَم
آہ کرتا ہُوں تو صیّاد خفا ہوتا ہے

کہیں پر بیٹھ جا کیا دیکھتا ہے بزمِ ساقی میں
خُدا معلوم پہلے کِس طرف سے جام آ جائے

حوالہ جات

(۱) اصغر گونڈوی، شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر زبیدہ خاتون۔ شوکت لٹریری ایسوسی ایشن، کرنول، ۱۹۹۴ء۔ ص ۳۸
(۲) ''یادِ اثر''، ڈاکٹر محمد اسلام، اگست ۱۹۶۷ء ص ۲۹
(۳) ''اثر نمبر (نیا دور)''، میر غلام رسول نازکی، لکھنو، ستمبر ۱۹۶۷ء، ص ۹۳

کتابیات

''گلکدہ''، عزیز لکھنوی، صدیق بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۳۱ء
''انجم کدہ''، عزیز لکھنوی، انجمن ترقیِ ہند علی گڑھ، مارچ ۱۹۵۶ء
''عزیز لکھنوی: حیات اور کارنامے''، ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی، لکھنو، ۱۹۸۴ء
''نشاطِ روح''، مشمولہ ''کلیاتِ اصغر گونڈوی''، پنجاب بک ڈپو، لاہور، جنوری ۲۰۱۰
''سرودِ زندگی''، اصغر گونڈوی، سنٹرل بک ڈپو، دہلی
''دیوانِ اصغر''، اصغر گونڈوی،: نظامی پریس، بدایوں
''آیاتِ وجدانی'' یاس یگانہ، طبع اول ۱۹۲۷ء، طبع دوم ۱۹۳۴ء، طبع سوم ۱۹۴۶ء
''گنجینہ''، مطبوعہ ۱۹۴۷ء مشمولہ کلیاتِ یگانہ، اکادمی بازیافت، کراچی، جنوری ۲۰۰۳ء
''غیر مدون کلام'' ایضاً
''باقیات'' ایضاً
''اثر لکھنوی: حیات اور کارنامے''، محمود خاور، شالیمار پبلی کیشنز، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۷ء

خاور چودھری
(اسکالر پی ایچ ڈی اُردو۔ ناردرن یونی ورسٹی، نوشہرہ)

سین ریو: سہ مصرعی نظموں کا تسلسل

Abstract

Senryu is a form of poetry in Japani literature. It consists of three lines and normally carries humoristic flavor. It takes its name after its originator Justice Karai Senryu. He compiled his twenty two books in this form of poetry during his life. Another bulk of one hundred and forty four books was published by his fans posthumously. This article deals with the detail how three lines poetry held a sound grounds in urdu poetry. Afterwards "Salathi" , Urdu Mahya, Haiku, and Tirvini held sway respectively. This article also uderlines the congeniality of circumstances for an exotic form of poetry imported from japan and nourished by Pakistani poets. Senryu has proved to be the best medium for humour. As ghazal recedes to a lighter tone in Hazal, so is the seriousness of Haiku counterfeited by Senryu. Poets of the Sub-continent who used this medium of poetry are discussed in detail with special reference to their works in this article.

اُردو شاعری میں اصناف و ہیئات کا تنوع ہے۔ مشرق و مغرب کی سیکڑوں بوقلمونیوں نے اس کا دامن کشادہ کیا۔ عربی و فارسی اور ہندی ادب تو اس کے خمیر میں شامل تھے ہی؛ فرانسیسی، روسی، جاپانی اور اطالوی ادب کا رَس جَس اور تاثیر بھی اس کے مزاج میں رَچ گئے۔ اس اعتبار سے اُردو شاعری کی عریض و بسیط سلطنت کا اندازہ کیا جائے تو بلاشبہ کئی منطقوں تک رسائی لازم ہو جاتی ہے۔ قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب، زٹل، ہجو، مسدس، مخمس، مثلث، چہار بیتی، رخصتی، سہرا، ترانہ، گیت اور دوہا جیسی مشرقی اصناف و ہیئات کی ایک کہکشاں تو بہت جگ مگاتی رہی ہے؛ ساتھ ہی سانیٹ، ترائیلے، لمرک، نظمِ آزاد، واکا، رینگا اور دوسرے شعری مزاجوں نے بھی جگہ بنائی۔

خصوصاً جاپانی صنفِ سخن ہائیکو نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ پہلے پہل شاہد احمد دہلوی کے رسالے ''ساقی'' نے اہلِ اُردو کو جاپانی اَدب سے روشناس کرایا؛ پھر ڈاکٹر محمد امین اور محسن بھوپالی کے توسط سے جاپانی اصناف نے فروغ پایا۔ کراچی کے شاعروں نے جاپانی قونصل خانے کی تحریک اور حوصلہ افزائی کی بنا پر اس جانب زیادہ توجہ دی۔ اَسی کی دہائی کے آغاز میں ڈاکٹر محمد امین (ملتان) کی ہائیکو کا اوّلین مجموعہ شائع ہو چکا تھا لیکن محسن بھوپالی نے ان نظموں کے وزن پر اعتراض کیا اور اپنی ہائیکو نظموں کو اُردو کی اوّلین ہائیکو قرار دیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اُردو شاعروں نے جہاں ہائیکو کے جاپانی مزاج اور مضمون میں کثرت سے تصرف کیا؛ وہاں اس کی عروضی تجسیم میں بھی تبدیلیاں کیں۔ شروع شروع میں ہمارے سامنے مساوی الاوزان ہائیکو نظمیں آئیں۔ اس دور میں بحروں کا امتیاز نہیں رکھا گیا۔ گویا اُردو غزل کے لیے موجود رعایت سے استفادہ کیا۔ پھر بتدریج اس کا وزن پانچ سات پانچ طے کر لیا گیا۔ ان سترہ سالموں کے لیے:

فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فع

کی صورت وضع کی گئی۔ اس کے بعد بھی دونوں روشیں موجود رہیں اور اَب بھی یہ اثرات موجود ہیں۔ اسی فضا میں ''سین ریو'' ہائیکو کے وسیلے سے اُردو زبان میں منتقل ہوئی اور بعض شاعروں نے اسے سجایا سنوارا۔ اس کی ہیئت بعینہٖ ہائیکو جیسی ہے، البتہ مزاج اور موضوع مختلف ہے۔ سین ریو پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ دوسری سہ مصرعی اصناف پر بھی بات ہو جائے۔

مثلث:

اُردو شاعری میں مثلث کی ہیئت مروج رہی ہے۔ مولوی نجم الغنی رام پوری نے اسے مساوی الوزن قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ یہ تین مصرعوں کے بند پر مشتمل نظم ہے؛ جس کا پہلا بند ہم قافیہ ہوتا ہے اور باقی تمام بندوں کے پہلے دو مصرعے متحد القوافی ہوتے ہیں اور تیسرا مصرع اوّلین بند کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ (1) شمیم احمد نے اسے مسمط کی پہلی ہیئت قرار دیا اور باقی ترتیب وہی بیان کی۔ (2) ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے بھی یہی تعریف اور ترتیب بیان کی ہے۔ (3) قیامِ پاکستان کے آس پاس بھی سہ مصرعی نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ مخمور جالندھری کی نظموں کا مجموعہ ''مختصر نظمیں'' 1946 میں شائع ہوا۔ ان کی نظموں میں موضوعاتی اور ہیئتی تنوع ہے۔ بالعموم معریٰ کی صورت ہے اور قوافی کا التزام نہیں لیکن فکری وسعت اور جدت طرازی کا خصوصی اہتمام

ہے۔ یہ مثالیں دیکھیں:

(۱)
تُو کیا جانے تیرے سر پر
وقت کا چرخا گھوں گھوں کرتا
کات رہا ہے بال سفید

(۲)
اک اور ناؤ کنارے پہ پھر ڈوب گئی
امید تھی کہ سمندر کی موجِ کف آلود
اٹھی، بلند ہوئی اور پھر سے ڈوب گئی

(۳)

گزرا تھا ابھی کون سڑک سے کہ ابھی تک
ہاتھوں میں ہے بنئے کے اسی طرح ترازو
درزی کی سوئی پہلے جہاں تھی، ہے وہیں پر (4)

ثلاثی:

حمایت علی شاعر ''ثلاثی'' کے بنیاد گزار ہیں۔ اُنھوں نے تین مصرعوں میں صد رنگ شمعیں اُجالیں اور انھی کی تحریک پر کچھ شاعر اس طرف متوجہ ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ثلاثی کو پنجابی ماہیا سے مماثل کہا اور ساتھ ہی ایک اور سہ مصرعی ہیئت ''تروینی'' کا ہم پلہ بھی قرار دیا۔ ان کے نزدیک ثلاثی اور تروینی کے پہلے دو مصرعے ایک مکمل شعر کی مانند ہیں؛ البتہ تیسرا مصرع خیال کی تکمیل کرتا ہے۔ (5) پنجابی ماہیا کا امتیاز یہ ہے، کہ اُس کا پہلا مصرع معنوی اعتبار سے الگ ہوتا ہے۔ وہ محض قافیہ پیمائی کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ثلاثی کا ہر مصرع اہم ہوتا ہے۔ تروینی کی خاصیت یہ ہے، کہ اُس کا تیسرا مصرع کہیں تو مستزاد کی صورت میں ہوتا ہے اور کہیں کلیتاً پہلے دو مصرعوں میں پیوست۔ اس اعتبار سے یہ ثلاثی کے قریب کی چیز ہے۔

حمایت علی شاعر کی ثلاثی نظموں کا پہلا اور تیسرا مصرع عموماً مقفّٰی ہوتا ہے۔ باعنوان اور مساوی الاوزان ان نظموں میں بحر کی کوئی قید نہیں۔ گویا غزل کی طرح ہر بحر میں ثلاثی کہی جاسکتی ہے۔ خیال کا ارتقاع اور بیان کی وسعت بہ ہر حال ایک شان کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ یہ دو مثالیں دیکھیں، جن میں رعنائی بھی ہے اور گہرائی بھی:

[شاعری......پیغمبری]
پھر کوئی فرمان اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر، محوِ انتظارِ جبرئیل (6)

[ضرورت]
کروں انکار یا اقرار، لیکن یہ حقیقت ہے
وہ خالق ہی سہی میرا، میں بندہ ہی سہی اُس کا
مجھے اُس کی ضرورت ہے، اُسے میری ضرورت ہے (7)

مقبول نقش، انور علی انور اور پروفیسر ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی ثلاثی نظموں میں یہی ترتیب دکھائی دیتی ہے۔ ان کے برعکس ظہیر غازی پوری کے یہاں رائج ہیئت کے ساتھ ساتھ قوافی کا نظام بدلتا رہتا ہے۔ کہیں اُن کے آخری دو مصرعے متحد القوافی ہوتے ہیں اور کہیں پہلے دو۔ اس اعتبار سے

اُن کے قوافی میں تنوع ہے۔ اکثر شاعروں کے یہاں مردّف ثلاثی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ بالترتیب درج شعرا کی ایک ایک نظم دیکھیں:

مقبول نقش:

[آسمان پرواز]
نظر اپنی یقین پر رکھنا
خوب ہے، فکرِ آسمانِ پرواز
پاؤں لیکن زمین پر رکھنا (8)

انور علی انور:

سونی، سنسان، سڑک کا سینہ
اس کی سمٹی ہوئی وسعت میں نہاں
کتنے اسرار کا ہے گنجینہ (9)

پروفیسر ڈاکٹر طاہر سعید ہارون:

اپنے ہاتھ اُٹھائیں
خاطر اپنے دیس کے
مانگیں سبھی دُعائیں (10)

ظہیر غازی پوری:

[دعویٰ]
کچھ نہیں اس جہاں میں ناممکن
پتھروں پر بھی دوب اُگتی ہے
بے حساب اور خوب اُگتی ہے

[امکاں]
فکر ہے دل پر خراشوں کی طرح
خواہشیں ہیں زندہ لاشوں کی طرح
زندگی شاید اپاہج ہوگئی (11)

ماہ طلعت زاہدی کی سہ حرفی نظموں میں کہیں ثلاثی کی روایت جھلکتی ہے تو کہیں تروینی کا لوچ رَس۔ معریٰ نظم کا عکس بھی ہے اور عمومی روش سے انحراف بھی۔ یہ مثالیں دیکھیں:

ہوا کی لہر سے آباد ہیں سائے درختوں کے
ابھی اپریل کا آغاز ہے اور پھول کھلتے ہیں
جل اُٹھے گا مگر ملتان کوئی دن ہی جاتا ہے

پسینہ موت کا آئے گا ، ایسی لو چلے گی اَب
رُکے گا سانس ، دل بیٹھے گا ، ہوگا حبس کا عالم
جلیں گے روز وشب ملتان کے سلگیں گے بام و در
ستمبر بھی نہیں کم پر یہ رخصت کا مہینہ ہے
تسلی کے اُنھی چھینٹوں سے دل کو زندہ رکھتے ہیں
یونہی مر مَر کے ہم ملتان والے جیتے ہیں (12)

یہ سہ حرفیاں مخمور جالندھری کی نظموں کا تسلسل دکھائی دیتی ہیں۔

تروینی:

گلزار نے نئی ہیئت ''تروینی'' کے نام سے پیش کرتے ہوئے اس کی وجہ تسمیہ بیان کی، کہ اس کے پہلے دو مصرعے گنگا جمنا کی طرح مل کر ایک شعر کی تکمیل کرتے ہیں اور تیسرا مصرع سرسوتی کی حیثیت رکھتا ہے؛ جو پوشیدہ ہے۔ تروینی کا کام سرسوتی ظاہر کرنا ہے۔ تروینی کی ابتدا ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہوئی۔(13) پاکستان میں اسے فروغ ملا اور یہیں سے مجموعے بھی شائع ہوئے۔ شاعر علی شاعر کی تحریک سے اسے جلا ملی۔ گلزار کا مجموعہ ''تِروینی'' کے نام سے پاکستان میں شائع ہوا۔ شاعر علی شاعر (تروینیاں)، ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم (نعتیہ تروینیاں)، زیب النسا زیبی (تیرا انتظار ہے)، پروفیسر ڈاکٹر طاہر سعید (بارش میں دھوپ)، زعیم رشید (تروینی تیرے نام) اور آصف ثاقب (ساون رُت) کے مجموعے شائع ہوئے۔ پاک و ہند کے بعض شعرا نے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اسے اختیار کیا؛ البتہ کچھ پاکستانی شاعر سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

گلزار:

شعلہ سا گزرتا ہے مرے جسم سے ہو کر
کس لو سے اُتارا ہے، خداوند نے تم کو
تنکوں کا مرا گھر ہے، کبھی آؤ تو کیا ہو!(14)

پروفیسر ڈاکٹر طاہر سعید ہارون:

کیسی نگری پھول نہ کلیاں
سائیں سائیں کرتی گلیاں
ویرانی کو جیبھ لگی ہے(15)

شاعر علی شاعر:

مجھ کو بھگونے کی سازش میں
موسم نے سرگوشی کی تھی
آٹھوں پہروں رویا ہوں(16)

آصف ثاقب:

شرم سے میں ہوں پانی پانی
ڈھونڈ رہا ہوں تیرا ثانی
جھوٹی پڑی ہے پیت کہانی(17)

زیب النسا زیبی نے اپنی تمام تروینی نظموں کو عنوان سے سجایا ہے اور اب تک سب سے ضخیم مجموعہ بھی انھی کا ہے۔ حالیہ برسوں میں زعیم رشید تروینی کے اُفق پر نمایاں ہوئے ہیں۔ دونوں شاعروں کی ایک ایک تروینی بالترتیب ملاحظہ کیجیے:

[یہ مظلوم]
کون سنے گا ان کی کہانی
کس کام آئیں گی جاگیریں
ترس رہے ہیں روٹی کو جب(18)

کتنے للچاوے دیے اُس نے مجھے
میں بھی باتوں میں مگر آیا نہیں
زندگی.....سر سے اُتاری، پھینک دی(19)

معروف ہندوستانی شاعر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے تروینی (تربینی) کی ہیئت میں بعض تبدیلیاں کیں۔ مصاریع کی تعداد تو وہی رکھی؛ البتہ ہر مصرع الگ وزن میں کہا۔ پہلا

مصرع مختصر، دوسرا طویل اور تیسرا طویل تر۔ ان کے یہاں بحروں کا تنوع ان کے تجربوں کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ ترو ینی نظمیں دیکھیں:

لوگ خاموش ہوئے — فاعلاتن، فعلن
جاگتے ہیں درو دیوار — فاعلاتن، فعلاتن، فعلن
آدمی جسم کے اندر بھی جلا ہے اکثر — فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن

فصیلِ جسم سے نکل — مفاعلن، مفاعلن
جہان میں سکون کی تلاش کر — مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن
ہر ایک سمت بے کلی کا ہم نشیں رواج ہے — مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن

ہم اور کہاں تک — مفعول، فعولن
تدبیر کے سائے میں رہیں گے — مفعول، مفاعلن، فعولن
تقدیر بہت دُور فضاؤں میں کھڑی ہے — مفعولن، مفاعیل، مفاعیل، فعولن (20)

مناظر عاشق ہرگانوی کے اس تجربے کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔ اس کا بڑا سبب غالباً ہر مصرعے کا الگ وزن ہے۔ کیوں کہ عموماً مساوی الاوزان ترو ینیاں ہی سامنے آئی ہیں اور اسی میں آسانی ہے۔ اس کے برعکس ایک خاص بندش کا احساس ہوتا ہے۔

سہ الگی:

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ایک اور ہیئت ''سہ الگی'' کے مخترع بھی ہیں۔ اس ہیئت میں بحر، قافیہ اور ردیف کی بندش نہیں۔ کسی بھی بحر میں مساوی الاوزان مصرعوں میں یہ نظم کہی جاسکتی ہے اور اس کے تمام مصرعے معریٰ کی صورت میں قافیہ اور ردیف کے التزام سے آزاد ہیں۔ یہ نام الگ سے رواج نہ پا سکا۔ سہ الگی کے نمونے دیکھیں:

(۱)
بھنور کے پیچ کشتی کر رہی ہے
تھپیڑوں کے درو دیوار سے جنگ
قرینہ ہے کہ اب ساحل ملے گا

(۲)
کستے ہیں مجھ پہ طعنے
خطرے ہیں تیری وفا
بن گئے پرچم کے افسانے

(۳)
روشنی کا خیال کیا کرتے
ہم نے راہیں گزار دیں ساری
ایک جگنو بھی ہم سفر نہ ملا (21)

ماہیا:

پنجابی ماہیا ڈیڑھ سطری مروج رہا ہے۔ اُردو میں جب ماہیا کہا گیا تو بالعموم تین مصرعوں کو محیط رہا۔ حیدر قریشی اور ان کے رفقا کی تحریک سے یہی روش عام ہوئی؛ البتہ بعضوں نے ڈیڑھ مصرعوں کو اہم جانا اور بعضوں نے مساوی الاوزان ماہیے کہے۔ حیدر قریشی کی تحریک پر گامزن شعرا اس وزن کو اہم جانتے ہیں:

مفعول، مفاعیلن
فعل، مفاعلین
مفعول، مفاعیلن

اس وزن میں دوسرا مصرع ایک سالمے کی کمی کے ساتھ آیا ہے؛ جب کہ ہائیکو کا دوسرا مصرع باقی مصرعوں سے طویل ہوتا ہے۔ اس کے پہلے اور تیسرے مصرعے میں پانچ سالمے ہوتے ہیں اور دوسرے میں سات۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور امین بابر کا اس وزن میں بالترتیب ایک ایک ماہیا دیکھیں:

تہذیب ادا ٹوٹی
دھوپ چمکنے سے
شبنم کی انا ٹوٹی (22)

پُرکیف نظاروں کا
لُطف ادھورا ہے
مانگے کی بہاروں کا (23)

جدید اُردو شاعری میں مثلث نے کم ہی جگہ پائی، اس کے برعکس ثلاثی کو کچھ پذیرائی ملی۔ تروینی کا چہرہ بھی زیادہ نہیں چمک سکا۔ ایک لہر اُٹھی، بیٹھی اور اب پھر اٹھی ہے، جس سے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ البتہ ماہیا اور ہائیکو ایسی نظمیں ہیں؛ جن کی توانا گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ماہیا میں دیہات کی سادگی اور زرعی زندگی کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ پنجاب کے کھیتوں کھلیانوں، گھروں چوباروں اور بیٹھکوں میں نمو پانی والی زندگی اور اس کے متعلقات ماہیا کے تشکیلی عناصر ہیں۔ اُردو ماہیا میں یہ فضا پوری طرح متشکل نہیں ہوئی۔

ہائیکو:

اُردو ہائیکو پر پختہ رنگ تو غزل کی روایت کا دکھائی دیتا ہے؛ البتہ کہیں کہیں اُردو ماہیا کی فضا بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ہائیکو کا ایک خاص مزاج اور ماحول ہے؛ جسے اپنائے بنا بات نہیں بنتی۔ اور بہ قول ڈاکٹر عنوان چشتی:

> ہائیکو میں کوئی ایک لفظ مرکزی اور بنیادی ہوتا ہے، جو ذہن کو معانی کے تمام

> امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ چوں کہ ہائیکو اور جاپانی شاعری کا پس منظر مخصوص قسم کی بدھ تہذیب اور فطرت و مظاہرِ فطرت ہیں؛ اس لیے ہائیکو میں اس وسیع پس منظر کو علامتوں اور پیکروں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔(24)

اہلِ اُردو نے ان پابندیوں کو عملاً قبول نہیں کیا۔ کراچی کے شاعروں سمیت پاک و ہند کے اکثر شاعروں کے یہاں متحد القوافی، بوقلموں اور ہمہ رنگ موضوعاتی ہائیکو نظمیں نظر آتی ہے۔ استثنائی حالتیں موجود ہیں۔ اب مخصوص وزن کی پابندی بھی کی جارہی ہے اور مساوی الاوزان ہائیکو نظمیں بھی موجود ہیں:

پیرزادہ قاسم:

پروانوں کو کیوں دیتے ہو تم آزار بہت
یہ غم دیدہ، زخم رسیدہ جانیں تم سے کہتی ہیں
ہم خود اپنی جانوں پر کرتے ہیں وار بہت (25)

ایسی کئی مثالیں ہیں، جو ہائیکو کے مروج وزن کے برعکس ہیں۔ بعد میں جاپانی سفارت خانے کے تحت ہونے والے مشاعروں میں مخصوص وزن کا التزام بھی کیا گیا۔ کچھ مثالیں دیکھیں:

راغب مرادآبادی:

ہریالی ہرسُو
پھولوں کی بھی ہے خوشبو
پہلو میں ہے تُو (26)

اقبال حیدر:

خوشبوؤں کے سنگ
چیری اور چنبیلی کے
پھیل رہے ہیں رنگ (27)

ثروت سلطانہ ثروت:

اک گلدستہ ہے
اُردو کا جاپانی سے
پیارا رشتہ ہے (28)

وضاحت نسیم:

دلکش بات قبول
آؤ چنبیلی میں گوندھیں
چیری کے پھول (29)

دوہکا:

ہائیکو میں یہ تجربہ بیکل اُتساہی نے کیا۔ اُنھوں نے ہائیکو کی ہیئت اور دوہے کے وزن (دوہا چھند) کو ملا کر ایک نئی فارم تشکیل دی۔ اس کا نام بھی دوہا اور ہائیکو سے مستعار لیا۔ اُنھوں نے دوہا چھند مکمل اختیار نہیں کیا بلکہ مصرع کا پہلا جزو:

فعلن فعلن فاعلن

کاٹ کر دوہکا میں برتا ہے۔ ان کی دوہکا نظموں میں وزن کے علاوہ پوری فضا ہائیکو کی ہے۔ ان نظموں میں کہیں کہیں سین ریو کا رَس جَس بھی موجود ہے:

(۱)
چھت پر بیٹھی رہ گئی
دھوپ صبح سے شام تک
سب کے طعنے سہ گئی (30)

(۲)
گوری تیرے گاؤں میں
پیپل برگد ٹہل رہے ہیں
موسم باندھے پاؤں میں (31)

دوسری نظم کا دوسرا مصرع غالباً کمپوزنگ کی غلطی کا شکار ہوا۔

سین ریو:

ہائیکو کی طرح سین ریو بھی سترہ سالموں کو محیط ہے اور ترتیب بھی وہی پانچ، سات، پانچ ہے۔ اُردو شاعری میں اس کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں ؛ بلکہ یہ ہائیکو کے بہت بعد میں ہمارے یہاں الگ شناخت قائم کرنے والی صنف ہے۔ اوّل اوّل شاعروں نے اس کے مبادیات ومخارج کو سمجھے بغیر بھی برتا۔ ہائیکو اپنے مزاج میں سنجیدگی، متانت، لطافت اور مخصوص مذہبی میلان رکھتی ہے؛ جس کا محیط فطرت اور مظاہرِ فطرت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے برعکس سین ریو طنز کے نشتر اور مزاح کی گدگدی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس لیے یہ ہائیکو سے یکسر مختلف ہے۔ محض وزن کی بنیاد پر اسے ہائیکو کے مماثل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس تناظر میں تو پھر دوہا، سورٹھا، ساکھی اور رولا کو بھی مماثل قرار دیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ یہ تمام اصناف دوہا چھند میں ہی ہیں۔ دوہا اور ساکھی کی ہیئت میں تو معمولی تفریق بھی نہیں۔ دونوں کا بسرام تیرہ ماتروں پر ہوتا ہے اور باقی مصرع گیاروں ماتروں کو محیط ہوتا ہے۔ سورٹھا میں یہ ترتیب اُلٹ جاتی ہے۔ مصرع کا پہلا حصہ گیارہ جب کہ دوسرا جز تیرہ ماتروں کا حامل ہوتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ البتہ ساکھی میں ناصحانہ مضامین جگہ پاتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے؛ جس طرح دوہا اور ساکھی ایک ہی وزن میں ہونے کے باوجود الگ موضوعاتی شناخت رکھتی ہیں؛ بعینہٖ ہائیکو اور سین ریو کا معاملہ ہے؛ ان کا موضوعاتی بُعد غزل اور ہزل کی صورت میں واضح ہوتا ہے۔

جاپانی سین ریو کا سلسلہ ''ایدوعہد'' (سترہویں صدی) سے جاملتا ہے۔ ہائیکو کی ابتدا تو گیارہویں صدی میں ہوچکی تھی لیکن اس کی صحیح نشوونما اور ترقی کا دور سترہویں صدی ہے۔ جس طرح ہائیکو کے فروغ وارتقا کے حوالے سے باشو کا نام لیا جاتا ہے، اسی طرح سین ریو کی حیاتِ نو کے باعث جسٹس کارائی سین ریو کا نام تسلیم شدہ ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ صنفِ سخن انھی سے معنون بھی ہے۔ ایدوعہد میں سین ریو کا الگ سے وجود نہ تھا۔ ایک اور مقبول صنفِ سخن ''میکو'' (Meaku) کے شروع میں تین مصرعے جوڑ لیے جاتے تھے۔ ترتیب یہی پانچ، سات، پانچ تھی۔ بعد میں اسے میکو سے الگ کرکے برتا جانے لگا۔ گویا جس طرح غزل نے قصیدے سے

الگ ہوکر تفوق حاصل کیا، اسی طرح سین ریو میکو کے وجود سے الگ ہو کر محوِ پرواز ہوئی۔

جسٹس کارائی سین ریو (Justice Karai Senryu) اگر اس جانب متوجہ نہ ہوتے تو یقیناً یہ صنف مٹ جاتی۔ اُنھوں نے اس کا کھوج لگایا، مرتب کیا اور ایک تسلسل سے بائیس مجموعے ادب کے قاری کو عطا کیے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے رفقا نے اس صنف کے فروغ کا بیڑا اُٹھایا اور ایک سو چوالیس مجموعے جاپانی ادب کی جھولی میں ڈالے۔ (32) یہی وہ تاریخی کام تھا؛ جس نے اس صنف کو جسٹس کارائی سین ریو کے نام سے مخصوص کر دیا۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر ظفر قدوائی، ڈاکٹر فراز حامدی، شارق عدیل، ڈاکٹر مسعود گوہر اور لبنیٰ انصاری نے اپنے مطالعوں کی بنیاد پر اسے ''ہزل'' سے مماثل قرار دیا ہے۔ (33)

اُردو ہائیکو نگاروں نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں دی؛ البتہ ان کی ہائیکو نظموں میں سین ریو یا تو خود دَر آئی اور اُنھوں نے اسے الگ نہیں کیا یا پھر منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اسے اختیار کیا۔ البتہ بعض شاعر خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھی میں نمایاں نام ساحر شیوی، سید معراج جامی، دل نواز دل، مشہود حسن رضوی اور محسن بھوپالی کا ہے۔ ساحر شیوی کے مجموعے ''دیواروں کے کان'' میں تین سو کے قریب سین ریو نظمیں ہیں۔ دل نواز دل کے مجموعے ''تکونے تارے'' میں اگرچہ ان نظموں کی تعداد زیادہ نہیں البتہ فکر و فن کے اچھے نمونے جمع کیے گئے ہیں؛ جو احساسات و جذبات کو مہمیز کرتے ہیں۔ مشہود حسن رضوی نامور شاعر شہاب دہلوی کے فرزند ہیں۔ ان کی سین ریو نظموں میں پختگی اور عمق ہے۔ محسن بھوپالی کی اس باب میں ایک قابلِ قدر شناخت ہے۔ وہ خلّاق شاعر ہیں۔ اُنھوں نے ہائیکو اور واکا نظموں کے فروغ میں اہم کام کیا۔ خصوصاً ان کی ہیئت اور فنی اقدار کی ترویج و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جاپانی ادب کے تراجم کیے اور طبع زاد ہائیکو اور واکا نظموں کے مجموعے پیش کیے۔ ان مجموعوں میں وہ ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت میں سین ریو کہتے بھی نظر آتے ہیں۔

بعض شاعروں نے اپنی ہائیکو نما نظموں کو سین ریو کا عنوان تو دیا ہے لیکن ان کی نظموں میں سین ریو کی مخصوص فضا سرے سے مفقود یا پھر ماند ہے۔ بہ ہر حال ایک تجربے کے لحاظ سے ان کی تاریخی اہمیت ضرور رہے گی۔ یہاں اُن سین ریو کی کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں؛ جو فکری و فنی معیارات کی پاسدار ہیں:

محسن بھوپالی:

(۱)	(۲)
لمبا چوڑا لان	برگد کے نیچے

نو دولتیے کے گھر میں
چھوٹا دستر خوان
بچوں کا بے ہنگم شور
ملّا محو خواب (34)

(۳)
کاٹا جب امرود
مجھ سے پہلے کھانے کو
کیڑا تھا موجود

(۴)
وہاٹ از ''ہو اِز ہو''
جھوٹی شہرت کا پھندا
کیوں پھنستا ہے تُو (35)

ان نظموں میں لہجے کی کاٹ اور طنز کی ترشی ایک اُٹھتی ہوئی لہر کی مانند موجود ہے؛ جو احساس پر تازیانے کی صورت پڑتی ہے۔ مزاح کی زیریں لہر بھی اپنا کام دکھاتی ہے۔ پہلی نظم میں تلخی کا احساس نہیں ہوتا لیکن بین السطور موجود کرب اور جھنجلاہٹ کی شدت اُس وقت سوا ہو جاتی ہے؛ جب قاری لفظوں کی قید سے نکل کر فکر کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ طنز و مزاح کا تعلق دُکھ کی شدت سے ہے؛ جس قدر گھاؤ زیادہ گہرا ہوگا؛ اُسی اعتبار سے مزاح اور طنز کی تیر اندازی ہوگی۔

ساحر شیوی:

(۱)
کیسا ہے یہ پھیر
چوہے سے ڈرنے والی
بلی بن گئی شیر

(۲)
سج دھج دیکھ اس کی
نو سو چوہوں کو کھا کر
حج کو چلی بلی

(۳)
پانی مہنگا ہے
لیکن انسانوں کا لہو
کتنا سستا ہے

(۴)
لیلیٰ لیلیٰ کر
رات میں اپنی بیوی کو
یوں پھسلایا کر

ساحر شیوی نے سیکڑوں سین ریو نظمیں کہیں۔ اس اعتبار سے ان کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی اور بیان کا تنوع ہے۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں ضرب الامثال اور محاوروں کو خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ پہلی تین نظمیں انھی رنگوں میں رنگی ہوئی ہیں۔ چوتھی نظم بھی اُردو کی روایات کا پتا دیتی ہے۔ ساحر شیوی کا قلم اس میدان میں خوب رواں ہے۔ اُنھوں نے جدت طرازی کا ہتھیار بھی استعمال کیا اور پرانی اقدار کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا؛ البتہ اُن کے یہاں کہیں کہیں سین ریو کا مخصوص رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور اُردو شاعری کے عمومی مضامین جگہ پانے لگتے ہیں۔ یہ مثالیں دیکھیں:

(۱)
اللہ ہی سے مانگ
سچے دل سے جو نکلے

(۲)
کر میرا وشواس
میرا دل اور میری جاں

سنتا ہے وہ بانگ
گروی تیرے پاس (36)

ان دونوں نظموں میں طنز ومزاح کی صورت نمایاں نہیں؛ البتہ تبلیغ اور شکوہ کی تاثیر دیکھی جا سکتی ہے۔

دل نواز دل:

(۱)
گنجے دولت مند
بالوں والے فرد فقیر
گنجی نوچے بال

(۲)
ڈفلی بجنے پر
اک بندر ناچے تو
کتنے ہنستے ہیں

(۳)
اب دُنیا کا خون
جیسے جوہڑ کا پانی
جیسے کالا لُون

(۴)
چمچ اور چمچہ
دونوں میں ہے فرق بہت
اک شہد اور اک زہر (37)

ہائیکو نگاری میں دل نواز دل کا ایک خاص مقام ہے۔ اُنھوں نے اس صنف کے فنی رموز پر تفصیل سے لکھا اور جاپانی شاعری کی تاریخ میں غوطہ زن ہو کر کئی موتی نکال لانے میں کام یاب ہوئے۔ اس لیے جب وہ سین ریو کی طرف آئے تو اس کے مزاج اور سطوت کا پوری طرح خیال رکھا۔ پہلی نظم میں فلسفۂ جبر وقدر کی جھلک ہے۔ دوسری اور تیسری نظم میں انسان کی بے حسی پر نشتر زنی واضح ہے۔ چوتھی نظم میں نکتہ رسی بھی ہے اور انسانی جبلت کے ایک منفی پہلو کی نشاندہی بھی۔ دل نواز دل مشّاق اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں فکر وفن کی یکجائی اُنھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے تجربات ومشاہدات کو ذہن کی کٹھالی میں کندن بنا کر پیش کیا ہے۔

مشہود حسن رضوی:

(۱)
نل ہیں سب خالی
قطرے قطرے کو ترسے
میری گھر والی

(۲)
حاجی قاضی سب
سستے داموں بکنے پر
ہر دم راضی سب

(۳)
مہنگا ہوا جب تیل
پھر سڑکوں پر کاروں کی
ہوگئی ریل پیل

(۴)
دہشت کا ہے راج
مارو، لوٹو پیسہ بھی
ایک پنتھ دو کاج (38)

زبان گھر کی ہو تو بیان پر قدرت لازم ہے۔مشہود حسن رضوی نے جذب و احساس اور مظاہر کے بیان کے لیے زبان کو خوبی سے استعمال کیا ہے۔کم لفظوں میں بڑا منظر نامہ پیش کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔انھوں نے سامنے کی باتوں اور روزانہ درپیش آنے والے حالات کو سین ریو کے پردے پر سجا کر پیش کیا ہے۔یہ منظر نامہ زیادہ تر ہمارا دیکھا بھالا ہے۔خصوصاً کراچی میں موجود جوار بھاٹا اور اس کے اثرات ہماری قومی زندگی میں پوری طرح دخیل رہتے ہیں۔دی گئی نظموں سے پوری طرح یہ کیفیت مترشح ہے۔ان کے یہاں محاورے کی چاشنی اور ضرب الامثال کی لطافت ایک خاص شان کے ساتھ موجود ہے۔نئے موضوعات پرانی بساط پر انھوں نے نہایت مہارت کے ساتھ بچھاتے ہیں۔مشہود کے یہاں ہمیں کراچی کی عمومی روش کا ایک اور اشاریہ بھی ملتا ہے۔اہلِ کراچی نے بالعموم مقفّٰی و مردّف ہائیکو نظمیں کہیں اور جب سین ریو کی طرف آئے تو اس رجحان کو ساتھ لے کر بڑھے۔جاپانی ہائیکو اور سین ریو قافیے کا تقاضا نہیں کرتیں؛ البتہ اُردو ماہیے میں اس کا التزام ہوتا ہے اور ہمارے شاعروں نے اپنی فضا کو غلاف بنا کر جاپانی رنگوں پر چڑھایا ہے۔یہ تاثیر جابجا دکھائی دیتی ہے۔

اُردو ہائیکو نگاروں میں سے بعض نے براہِ راست سین ریو کو اختیار کیا اور اسی عنوان کے تحت پیش بھی کیا لیکن بڑی تعداد ایسے شاعروں کی ہے؛ جنھوں نے ہائیکو کے تحت ہی سین ریو نظمیں پیش کیں۔یہ نظمیں اپنے موضوعات اور پیش کش کے اعتبار سے جداگانہ شناخت رکھتی ہیں اور تھوڑی چھان پھٹک سے قاری انھیں ہائیکو سے الگ کر لیتا ہے۔ذیل میں ایک انتخاب ان ہائیکو نگاروں کی نظموں سے پیش کیا جا رہا ہے؛ جنھوں نے ہائیکو کے ذیل میں ہی سین ریو نظمیں کہیں۔

وضاحت نسیم: (۱) (۲)

(۱)	(۲)
بادل گہرا ہے	سورج ہو یا چاند
اس میں ایک سمندر ہے	اپنے اپنے گھر میں ہیں
جس پر پہرا ہے	روشن ہوں یا ماند (39)

وضاحت نسیم ہائیکو کی توانا آواز ہیں۔اُن کا شمار اُردو ہائیکو کے قافلے میں شامل اوّلین راہ گزاروں میں ہوتا ہے۔ہائیکو کے روایتی مزاج کی تابانی اور فکری اُٹھان ان کی نظموں کا خاص حوالہ ہیں۔دی گئی نظموں میں جبر و قدر کا فلسفہ نہایت خوب صوتی اور فنی ہنرمندی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ وضاحت نسیم کی نظموں میں الفاظ کا دروبست اور مصرع کی تکمیل خوبی کے ساتھ ہوتی ہے۔سہل ممتنع کے عمدہ نمونے ان کے یہاں کثرت سے موجود ہیں۔

انور فخری: (۱) (۲)

بارش ہوتی ہے	کیسی بلی ہے
دیکھو، ماسی پنگھٹ پر	سوسو چوہے کھانے کو
کپڑے دھوتی ہے	گھر گھر پھرتی ہے(40)

انور فخری سامنے کے موضوعات کو ہنر مندی کے ساتھ قلم بند کر کے قاری کے لیے ایسی فضا تشکیل دیتے ہیں؛ جو مانوس ہوتے ہوئے بھی انوکھی اور پُرکشش ہوتی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ پوری خوب صورتی کے ساتھ ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے۔

شعیب جاذب:

(۱)	(۲)
پائے گا مریخ	قدم قدم پہ سوچ
محوِ سفر ہے بھولا کتا	زر کی گیلی پھسلن سے
انسان کی تاریخ	آ جائے گی موچ(41)

شعیب جاذب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی ہائیکو نگاری محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں؛ بلکہ اُنھوں نے اُردو شاعری کی فنی وفکری روایات کو ہائیکو کے دامن پر ٹانک دیا ہے۔ ان کی سین ریو نظموں میں یہ تسلسل اور حکمت پوری طرح رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات متنوع لیکن چنیدہ ہیں۔ دی گئی نظموں میں لہجے کی کاٹ اور طنز کی تندی احساس میں جاگزیں ہوجاتی ہے۔ قاری کو جھنجھوڑنے کا ہنر شعیب جاذب کی مٹھی میں پڑا ہے۔

رئیس باغی:

(۱)	(۲)
چپ رہ، کچھ مت بول	لگتا ہے اچھا
تو کیا جانے شعر وادب	جانے کیوں اس ناری کو
اے احمق، بغلول	ساجن سے لڑنا(42)

رئیس باغی ہائیکو کے ہنر، فضا اور پس منظر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اُنھوں نے جاپانی ہائیکو کے تناظر میں اپنے خیالات ظاہر کیے؛ جو اس بات کی گواہی ہے، کہ وہ اس صنفِ سخن سے گہرا ربط ضبط رکھتے ہیں۔ چناں چہ جب اُن کی سین ریو نظمیں دیکھی جائیں تو اُن میں ایک خاص قسم کی لطافت، باریکی اور دُور بینی چھلکتی ہوئی ملتی ہے۔ اُن کا فکری کینوس وسیع اور اظہار کا سلیقہ ارتفاع آشنا ہے۔

مقبول نقش:

(۱)	(۲)
دن ہوجاتا ہے	کتنی پیتے ہو
میرا پڑوسی رات گئے	موت سے بدتر اک اک پل
جب گھر آتا ہے	پھر بھی جیتے ہو(43)

مقبول نقش کو سہ مصرعی اصناف کچھ زیادہ مرغوب ہیں۔ اُنھوں نے فنی متانت اور بلند آہنگی کو فکر کا آلہ بنایا اور قاری کے حوالے کیا۔ اُن کی سین ریو نظموں میں جستجو اور فکر انگیزی کے عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اس خاص تناظر میں جب قاری طنز کو جانچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے پیچھے ایک گہری روایت اور خاص کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے یہاں براہِ راست مخاطبت میں بھی بین السطور کہی گئی باتوں کا لطف موجود رہتا ہے۔

بقا صدیقی: (۱) (۲)

کلیاں مسلو گے
تم تو شہری بابو ہو
تتلی پکڑو گے

آہ کمرشل ہے
ہر شے کاروباری ہے
واہ کمرشل ہے (44)

بقا صدیقی معاشرے کے نباض کی صورت میں خود کو پیش کرتے ہیں۔ وہ تماش بین کے برعکس حکیم کا درجہ اختیار کرتے ہوئے معاشرتی ناسوروں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ معاشرے کی عمومی روش کو گم شدہ زاویوں سے چمکاتے اور احساس کی شمعیں اُجالتے چلے جاتے ہیں۔ اس تیز ترین اور بدلتی ہوئی دُنیا کا گہرا گھاؤ، جو ہماری اقدار کے سینے میں موجود ہے؛ اُسے اپنے نشتر سے کھرچتے چلے جاتے ہیں۔ زخموں کی تازہ کاری کا یہ عمل نیکی اور خوش سلیقگی کی طرف بڑھتا ہے۔

فراست رضوی: (۱) (۲)

مکر کا جادہ ہے
طرزِ محبت یاروں کا
ایک لبادہ ہے

پاس نہ تھا مفلر
سرد ہوا میں کھینچ لیے
کانوں تک کالر (45)

ہائیکو نگاری کے باب میں فراست رضوی مستند اور بڑے شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے تواتر کے ساتھ اس صنف کی آبیاری کی؛ اس عمل کے دوران میں اُن کے قلم سے سین ریو کے کچھ نمونے بھی ظہور پذیر ہوئے۔ اُن کا طرز میٹھا اور جاپانی روایات میں گندھا ہوا ہے۔ باشو اور کیشی کی گمشدہ لے اُن کے ہاتھ آئی معلوم ہوتی ہے؛ جسے جا بجا ظاہر کر دیتے ہیں۔ پہلی نظم براہِ راست طنز ہے؛ جب کہ دوسری نظم بے چارگی کا پردہ چاک کرتے ہوئے جبر کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔

سہیل احمد صدیقی: (۱) (۲)

بادل کی سازش
صحرا سوکھا ہے لیکن
کھیتوں میں بارش

اک دوجے کے سنگ
کب سے چہلیں کرتے ہیں
بطخیں اور کلنگ (46)

سہیل احمد صدیقی صحیح معنوں میں ہائیکو کے مجاہد ہیں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر محمد امین اور محسن بھوپالی کے بعد ہائیکو کو تحریک کی صورت دی۔ وہ بلاشبہ سراہے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس خاص تناظر میں اُن کا مطالعہ وسیع ہے؛ جوان کی نظموں میں خمیر کی صورت میں واضح ہوتا ہے۔ پہلی نظم میں قدرت کی تقسیم پر گہرا طنز ہے۔ دوسری نظم بھی معاشرتی ناہمواری پر تازیانے کی صورت ہے۔ اُنھوں نے اس فن میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

آفتاب مضطر: (۱) (۲)

(۱)	(۲)
آدمی جب پہنچا	زیست وہاں سستی ہے
اپنا بھونکنا بھول گیا	ایوانوں سے ملحق ہے
حیرت سے کتا	جو کچی بستی ہے(47)

ڈاکٹر آفتاب مضطر کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ فنِ شاعری کے لوازم اپنے ناخنوں میں رکھتے ہیں؛ چناں چہ اُن کی ہائیکو نظموں میں یہ ہنر نظر آتا ہے۔ ان کی سین ریو نظموں میں طنز پُرزور اور پُرشور ہے۔ وہ بغیر کسی مصلحت اور لگی لپٹی کے اپنی بات کہنے کے عادی ہیں۔ واضح طنطنہ اور نمایاں دبدبہ اُن کے لہجے کو جداگانہ شناخت عطا کرتا ہے۔

محمد اقبال نجمی: (۱) (۲)

(۱)	(۲)
آؤ چلتے ہیں	بھوکے بچوں کو
آج تو اس نے بور کیا	لوری سے بہلاتے ہو
کافی سنکی ہے	کتنے ظالم ہو(48)

محمد اقبال نجمی دہائیوں سے ہائیکو کو فیض یاب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس صنف کو اُردو کی روایتی فضا میں پوری طرح رچانے کی کام یاب کوشش کی۔ اُن کی نعتیہ ہائیکو نگاری اسی بات کی غمازی کرتی ہے۔ ان کی سین ریو نظمیں عمومی ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ اُنھوں نے طنز کے لیے بھی الگ پیمانہ اختیار کیا اور ایسے موضوعات منتخب کیے؛ جنھیں عمومی زندگی میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ دوسری نظم اسی طرز کا ایک حوالہ ہے۔

صالحہ کوثر: (۱) (۲)

(۱)	(۲)
ناچے ہے بندر	بارش کی گڑبڑ
لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں	تنہائی میں ڈستی ہے
کیسے سڑکوں پر	مینڈک کی ٹرٹر(49)

ہائیکو نگاری کے باب میں صالحہ کوثر مضبوط اور توانا حوالہ رکھتی ہیں۔ اُن کے یہاں جاپانی ہائیکو کی قدریں زیادہ مستحکم ہیں؛ چناں چہ جب وہ اس راستے میں بڑھتی ہیں تو کلاسیکی ہائیکو نگاری کے

عناصر ان کے ہمرکاب رہتے ہیں۔ درج نظموں میں مخلوق کی بے بسی اور زندگی جاری رکھنے کی کشمکش کا دیرینہ فلسفہ فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خاور چودھری: (۱) (۲)

(۱)	(۲)
سگرٹ، بیڑی، پان	راز چھپائے کون
اب تو ایسا کچھ بھی نہیں	دوست سپولے بن بیٹھے
شاعر کی پہچان	ہاتھ ملائے کون (50)

راقم کی ہائیکو نگاری کے تعارف میں محسن بھوپالی مرحوم نے 2005ء میں ماہنامہ ''ادبِ لطیف''میں ایک مضمون لکھا؛ جس میں اُنھوں نے درج بالا سین ریو نظموں کا بھی تذکرہ کیا۔ علاوہ ازیں راقم کے مجموعے ''ٹھنڈا سورج'' کو ''دی کولڈ سن'' کے نام سے پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف الحسینی نے انگریزی میں بھی منتقل کیا۔ یہ مجموعہ ہائیکو اور واکا کے علاوہ اُردو ماہیوں پر مشتمل ہے۔ اسی میں ہائیکو کے تحت کہیں کہیں سین ریو کا مضمون قلم بند ہوا ہے۔

سین ریو کو صرف پاکستان میں ہی پذیرائی نہیں ملی بلکہ اُردو کے دوسرے منطقوں میں بھی اسے اہمیت دی گئی ہے۔ خصوصاً انڈیا میں ڈاکٹر اسلم حنیف، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر فراز حامدی، طاہر رزاقی، شارق عدیل، سید مختار ٹونکی، ڈاکٹر عبید حاصل، ڈاکٹر طالب دھولپوری، ڈاکٹر شاہین اجمیری، وسیم اختر اور رفیق شاہین کی سین ریو نظمیں منظر پر آچکی ہیں۔ اگرچہ ہائیکو کے برابر اس صنف کو پذیرائی نہیں ملی اور جاپان قونصل خانے کی کوششیں بھی پوری طرح فیض یاب نہیں ہو سکیں لیکن اُردو میں یہ بے نرد بان بھی نہیں رہی۔ یہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ہائیکو نگاروں نے اسے بے اعتنائی سے ٹھکرایا نہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ گزشتہ چار دہائیوں میں مثلث کی ہیئت شعرا کو زیادہ مرغوب رہی۔ جس طرح حمایت علی شاعر سے منسوب ''ثلاثی''، گلزار کی وضع کردہ ''تروینی''، ڈاکٹر عاشق ہرگانوی کی ''سہ الگی''، ''اُردو ماہیا''، ''سہ حرفیاں''، ''سہ گانی''، ''ہائیکو'' اور ''سین ریو'' نظمیں اُردو کے دامن میں آئیں؛ اسی طرح ڈاکٹر فراز حامدی نے مثلث کی ہیئت میں ''دوہا چھند'' کے تجربات کیے۔ اُن کے ''دوہا مثلث''، ''دوہا ثلاثی'' اور ''دوہا معریٰ مثلث'' نظمیں بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

بیکل اُتساہی نے ہائیکو اور دوہا سے متاثر ہو کر ایک ہیئت ''دوہکا'' کے نام سے متعارف کرائی؛ جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہ منظر اس بات کا شہادت گزار ہے، کہ شاعروں کو مثلث کی جدید اصناف اور ہیئات دل پسند ہیں۔ یوں سین ریو کے پھلنے پھولنے کا امکان بہ ہر حال موجود ہے۔ ویسے بھی طنز و مزاح معاشرے کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک

ہے۔ ہر دور میں اس کی موجودگی ظاہر ہوتی آئی ہے۔ پورا امن اور پورا انصاف معاشروں میں خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ چناں چہ تحلیل نفسی کے لیے کسی ایسے آلے کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے؛ جو اس عمل کو تکمیل آشنا کرے۔ طنز و مزاح کو جبر اور گھٹن کی پیداوار سمجھا گیا۔ ظلم کے مراکز کے خلاف صف آرائی جہاں مشکل ہو جاتی ہے؛ وہاں یہ آلات کام آتے ہیں۔

اُردو شاعری کے کلاسیکی عہد میں زٹل اور ہجو کا چلن کتھارسس کے لیے ہی تھا۔ اگرچہ آج اس غرض کے لیے مختلف ہیئتیں اختیار کی گئی ہیں اور نثر سے بھی کام لیا جا رہا ہے لیکن سین ریو کے پنپنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہ نسبتاً آسان اور براہِ راست متاثر کرنے والی صنف ہے۔ محسن بھوپالی، دل نواز دل، وضاحت نسیم اور رئیس باغی کی سین ریو نظمیں اتنی طاقت رکھتی ہیں، کہ کسی بھی دوسری ہیئت کے مقابل پیش کی جائیں۔

حوالہ جات:

1۔ نجم الغنی، مولوی، رامپوری، بحر الفصاحت (اوّل)، مرتبہ قدرت نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، 2018، ص 187

2۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، انڈیا بک امپوریم، بھوپال، 1981ء، ص 127

3۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اُردو، اسلام آباد، 1985ء، ص 167

4۔ محسن بھوپالی، ہائیکو نگاری کے تسلسل میں ٹھنڈا سورج، مشمولہ: ماہنامہ ادب لطیف، جنوری 2005ء، ص 144

5۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات [توضیحی لغت]، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2011ء، ص 101

6۔ ادب لطیف، ماہنامہ، لاہور، اگست 1962ء ص 9

7۔ تجسس، ماہنامہ، ایڈیٹر احسان عظیم صدیقی، کوٹری، مئی 2006ء، ص 41

8۔ مقبول نقش، چشمِ خیال، ادارہ انوارِ خیال، کراچی، 1994ء، ص 44

9۔ ادب لطیف، ماہنامہ، لاہور، ستمبر 1958ء، لاہور، ص 25

10۔ طاہر سعید ہارون، ڈاکٹر، ترنگ/جلترنگ، بزمِ رنگ ادب، کراچی، 2010ء، ص 46

11۔ شاعری، کتابی سلسلہ، کراچی، مدیر سہیل غازی پوری، اپریل 2012ء، ص 103

12۔ ادب لطیف، ماہنامہ، ایڈیٹر: صدیقہ بیگم، لاہور، جولائی، اگست 2009ء، ص 150

13۔ گلزار، تروینی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2012ء، ص 5

14۔ ایضاً، ص 42

15۔ طاہر سعید ہارون، ڈاکٹر، بارش میں دھوپ، بزمِ رنگ ادب، کراچی، 2010ء، ص 78

16۔ شاعر علی شاعر، تروینیاں، بزمِ رنگ ادب، کراچی، 2009ء، ص 42

17۔ جاوید رسول جوہر اشرفی، تروینی کا ارتقا، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، 2014ء، ص 165

18۔ زیب النساء زیبی، تیرا انتظار ہے، زیبی اینڈ عائز از پبلی کیشنز، کراچی، 2009، ص 110

19۔ زعیم رشید، تروینی تیرے نام، نظمینہ پبلی کیشنز، لاہور، 2016ء، ص 25

20۔مظفرمہدی،ڈاکٹر،مناظر عاشق ہرگانوی کی شعری جہتیں،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،2014ء،ص116
21۔ایضاً،ص115-114
22۔ایضاً،ص97
23۔سپنوں کا میلہ،امین بابر،ادارہ پنجابی بال ادبی بورڈ،لاہور،2017ء،ص45
24۔عنوان چشتی،ڈاکٹر،اُردوشاعری میں ہیئت کے تجربے،انجمن ترقی اُردو(ہند)دہلی،1975،ص242
25۔اُردو میں ہائیکو، مستقبل اورامکانات،یونس حسنی،ڈاکٹر،رباب پبلی کیشنز،کراچی،1994ء،ص46
26۔معین الدین عقیل،ڈاکٹر(مرتب)،رشتۂ جاں،پاکستان جاپان کلچرایسوسی ایشن،سندھ،2003ء،ص27
27۔ایضاً،ص8
28۔ایضاً،ص19
29۔ایضاً،ص61
30۔ظہیرغازی پوری(انڈیا)اُردودُوہے:ایک تنقیدی جائزہ،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،2015،ص57
31۔ایضاً،ص25
32۔دیواروں کے کان،ساحرشیوی،بزم تخلیق ادب،کراچی2005ء،ص6۔7
33۔ایضاً،متفرق صفحات
34۔محسن بھوپالی،منظرپتلی میں،ایوانِ ادب،کراچی،1995ء،ص31-25
35۔محسن بھوپالی،چیری سے چنبیلی تک،کینوس کمیونی کیشنز،کراچی،2005ء،ص109-107
36۔ساحرشیوی،دیواروں کے کان،متفرق صفحات
37۔دل نوازدل،تکونے تارے،التحریر،لاہور،2000ء،ص224 تا235
38۔مشہودحسن رضوی،بارش میں دھوپ،کراچی2001ء،ص109 تا112
39۔وضاحت نسیم،دل چھونے والامنظر،کینوپس پبلی کیشنز،کراچی،فروری2006ء،ص82-48
40۔انورفخری،چلمن کے پیچھے،الحمدپبلی کیشنز،کراچی،جولائی2012ء،ص38-29
41۔شعیب جاذب،زخم اجالوں کے،اظہارسنزلاہور،دسمبر2007ء،ص58-57
42۔رئیس باغی،چیری کھلنے تک،باغِ ادب کراچی،2002ء،ص129
43۔مقبول نقش،چشمِ خیال،ص160
44۔ بقاصدیقی،مکڑی کاجالا،بزم محمود،کراچی،جنوری2000ء،ص142-140
45۔فراست رضوی،کہرمیں ڈوبی شام،اکادمی بازیافت،کراچی،نومبر2001ء،ص151-144
46۔سہیل احمدصدیقی،خوش کن ہے پت جھڑ،کینوپس،کراچی،2006ء،ص94-73
47۔آفتاب مضطر،سورج کے اُس پار،ڈائیلاگ پبلی کیشنز،کراچی،1997ء،ص145-133
48۔محمداقبال نجمی،نرگس کے پھول،فروغِ ادب اکادمی،گوجرانوالہ،2006ء،ص57-41
49۔صالحہ کوثر،وادی پھولوں کی،کراچی،2003ء،ص132-54
50۔خاورچودھری،ٹھنڈاسورج،سحرتاب پبلی کیشنز،اٹک،جنوری2006ء،ص10

آغا جہانگیر بخاری: اٹک

حج 2020 کرونا خدشات اور وبائی تاریخ

کرونا وائرس نے جو دنیا میں دہشت پھیلائی تو اس کے اثرات تجارتی، سماجی اور طبی جہات سے ہوتے ہوئے مذہبی عبادات و رسومات پر بھی وارد ہوئے۔ نتیجتاً سعودی حکومت نے عمرہ زائرین پر پابندی لگادی جس کی وجہ سے کئی روز تک مسجد الحرام کو بند رکھا گیا اور جمعہ 11 رجب 1441 ھ بمطابق 4 مارچ 2020ء کو مسجد الحرام کو دوبارہ کھولا گیا۔ اسی تسلسل میں ان شکوک کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ شاید اس سال حج کی عبادت بھی اس سے متاثر ہو۔ اور خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ اگر حج کو موقوف نہ بھی کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ بعض ممالک کے زائرین پر پابندی لگادی جائے اور حجاج کی تعداد انتہائی کم ہو۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا حج کی اب تک کی تاریخ میں کبھی حج موقوف بھی ہوا؟
مورخین اور علما نے تاریخ اسلام کے چالیس ایسے برسوں کا ذکر کیا ہے جن میں سیاسی حالات، جنگی واقعات، قدرتی آفات، مالی مشکلات، راہ زنی وغیر محفوظ راہ سفر، وبائی امراض اور دیگر وجوہات کی بنا پر حج موقوف رہا، کچھ اقوام شریک نہ ہوسکیں یا کچھ جزوی بندشیں رہیں۔ لیکن سب سے زیادہ جانی نقصان اور موقوفیت وبائی امراض کی وجہ سے ہوئی۔ ان مذکورہ برسوں میں سے کچھ پر نظر کرتے ہیں کہ کب اور کیوں حج مکمل یا جزوی موقوف ہوا، قلت زائرین رہی اور کیا آفات و امراض اس کا سبب بنیں۔

251 ھ عرفات کا قتل عام:

سنہ 251 ھ/ 865 عیسوی اسماعیل بن یوسف العلوی نے عرفات پر حملہ کر دیا اور حجاج کی ایک کثیر تعداد کو قتل کر دیا تھا۔

317 ھ قرامطہ کا حجر اسود چوری کرنا:

سنہ 317 ھ/ 930 عیسوی قرامطہ نے مسجد الحرام پر حملہ کر دیا اور اس کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے حجر اسود کو چوری کر لیا اور وہاں موجود افراد کو قتل کر دیا۔ حجر اسود ۲۲ برس تک اپنی جگہ پر موجود نہ تھا تاوقتیکہ سنہ ۳۳۹ ھ کو ابُو محمد شنبر بن الحسن اسے واپس لایا۔ قرامطہ کا خیال تھا کہ یہاں حج نعوذ باللہ اصنام پرستی اور شعائر جاہلیت میں سے ہے۔

حجرِ اسود کی بحرین منتقلی:

اُسی سال یعنی 317 ھ کے یوم ترویہ کو جب لوگ حالت احرام میں تھے، قرامطہ کے سردار اور بحرین کے بادشاہ اُبو طاہر الجنابی القرمطی نے حملہ کر دیا اور حجر اسود کو اس کی جگہ سے اکھاڑ لیا، اور اسے ھَجَر (موجودہ قطیف) بھیج دیا۔ اور بعد ازاں اسے بحرین منتقل کر دیا گیا۔ اس نے لگ بھگ 30 ہزار حجاج کو قتل کر دیا۔ وہ مقام ابراہیم کو بھی شہید کرنا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حجر اسود کو قطیف کے ایک قریہ جش میں ایک بڑی عمارت میں رکھ دیا اور اس جگہ کو حج کا مقام قرار دیتے ہوئے حکم جاری کیا کہ یہاں حج کیا جائے اس پر لوگوں نے ان احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا جس کی پاداش میں بے شمار لوگ قتل کر دیے گئے۔

372 ھ بنی العباس و بنی عبید کے اختلافات:

سن 372 ھ/ 983 ء کے بارے میں روایت ہے کہ اس سال سے لیکر 380 ھ تک بغداد کے خلفاء بنی عباس اور مصر کے خلفاء بنی عبید کے مابین مخالفت اور فتنوں کی وجہ سے کوئی بھی شخص عراق سے حج کے لیے نہ جا سکا تھا۔

428 ھ صرف مصری حجاج:

ایک روایت کے مطابق 428 ھ/ 1037 ء کو عراق سے کوئی بھی فرد حج کے لیے نہ جا سکا تھا اور صرف مصری زائرین نے شرکت کی جبکہ ایک دوسری روایت کے مطابق مصری اور چند دیگر علاقوں کے زائرین حج کے لیے پہنچ سکے تھے۔

650 ھ بغدادی زائرین دس برس بعد حرم پہنچے۔

سن 650 ھ/ 1253 ء کو خلیفہ المستنصر کی وفات کے بعد عراقی زائرین دس سال بعد حج کے لیے حجاز پہنچے۔

655 ھ/ 1257 ء کو حجاز میں سے کسی نے حج نہ کیا۔

1230 ھ طاعون کی وبا:

سن 1230 ھ/ 1814 ء کو حجاز مین طاعون کی وبا پھیل گئی جس سے 8 ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔

1246 ھ ہندوستانی وبا سے ہلاکتیں:

سال 1246 ھ/ 1831 ء کو حج کے موسم کے دوران اچانک ایک وبا پھوٹ پڑی جس سے تقریبا 75 فیصد حجاج جاں بحق ہو گئے۔ اس وبا کے بارے میں گمان یہ تھا کہ یہ ہندوستان سے آئی ہے۔

1253 ھ کی وبائیں:

1253ھ/ 1837ء میں مختلف وبائیں پھوٹنا شروع ہوگئیں اور یہ سلسلہ 1256ھ/ 1840ء تک جاری رہا۔

1263ھ کالرا کی وبا:

سال 1263ھ/ 1846ء کو کالرا کی وبا حجاج کے درمیان پھیل گئی اور یہ وبا 1850ء تک جاری رہی۔ یہی وبا 1863ء اور 1883 میں دوبارہ پھیلی۔

1281ھ روزانہ ایک ہزار حجاج کی وفات:

سن 1281ھ/ 1864ء میں ایک ایسی خطرناک وبا موسم حج کے دوران پھوٹ پڑی جس سے روزانہ ایک ہزار حجاج لقمہ اجل بننے لگے۔ اسی طرح 1871ء میں ایک ایسی ہی وبا مدینہ منورہ میں پھوٹ پڑی جس پر مصر سے طبیب آئے اور ایک مرکز قرنطینی قائم کیا گیا۔

1310ھ کالرا کی وبا:

سال 1310ھ/ 1892ء کو ایک بار پھر کالرا کی وبا پھوٹ پڑی اور اس بار اس کا حملہ بہت شدید تھا جس سے ہلاکتوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ انہیں دفنانے تک کا موقع نہ مل سکا عرفات اور منیٰ میں لاشوں کے انبار تھے۔

1313ھ ٹائیفائیڈ کی وبا:

سن 1313ھ/ 1895ء کو مدینہ سے آنے والے ایک قافلے میں ٹائیفائید کی وبا پھوٹ پڑی، جو کسی قدر میدان عرفات تک جا پہنچی لیکن مزید نہ پھیلی اور کچھ حجاج کو منیٰ میں متاثر کرنے کے بعد ختم ہوگئی۔

1408ھ کا گردن توڑ بخار:

سال 1408ھ/ 1987ء کے موسم حج میں گردن توڑ بخار کی وبا پھیلی جس سے تقریباً 10،000 حجاج متاثر ہوئے۔

دوران حج حرمین شریفین اور خطہ حجاز میں وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے کے بیشمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں، جن کی بڑی وجہ مختلف خطہ ہائے ارض سے مختلف المزاج ورواج اقوام کا یہاں پر جمع ہونا ہے۔

اس موسم حج کے دوران خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ سانس کے ذریعے پھیلنے والی دیگر وبائی امراض مثلاً انفلوئنزا، گردن توڑ بخار کے ساتھ کرونا وائرس کا حملہ بھی ہوسکتا ہے۔

کتاب " حج سو سال پہلے" میں ایک روسی حاجی اور سیاح عبدالعزیز دولتشین جو 1898ء اور 1899ء کے دوران حجاز مقدس آیا تھا، کے تاثرات اس طرح درج ہیں: ''کوئی بھی وبا عرفات

سے اٹھتی ہے اور منیٰ تک پھیل جاتی ہے، اگر آپ عرفات میں کوئی وبا نہیں دیکھتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موسم حج میں کوئی بیماری نہیں پھیلے گی"۔

کل کیا ہوگا یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن ہماری دعا ہے کہ اس سال کرونا کے بارے میں یہ سارے خدشات غلط ثابت ہوں اور حج موقوف نہ ہو۔

ماخذات:

1۔الحج توقف 40 مرۃ عبر التاریخ (پی ڈی ایف کتاب) از ابراھیم محمد
2۔ »الدارة« تكشف أسباب إلغاء الحج 40 مرة.. بعد تفشي » كورونا الجديد« از عبد العزیز الزھرانی
3۔مش أول مرة.. حوادث تاريخية تسببت في إخلاء الحرم المكي وإيقاف الحج.. از محمد تھامی زکی
4۔الحج توقف عبر التاريخ أكثر من 40 مرة.. فهل يتوقف مرة أخرى بسبب فايروس كورونا؟ از أريج الدجاني (/www.arabiaweather.com//:https)
5۔40 مرة توقف فيها الحج عبر التاريخ.. أمراض منعت الحجاج من زيارة بيت الله الحرام.. از محمود ضاحي (/www.elbalad.news//:https)

پروفیسر شوکت محمود شوکتؔ

نذر صابری کے علمی و تحقیقی اسفار

جناب نذر صابری (پ: یکم نومبر، ۱۹۲۳ء۔م: ۱۱ دسمبر، ۲۰۱۳ء) کے بارے میں عمومی ایک تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ جب سے اٹک آئے ہیں، کبھی انھیں باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی اور انھوں نے ساری عمر اٹک شہر ہی میں گزار دی ہے۔ ان کے اکثر احباب بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ نذر صابری کو اٹک شہر کی فضا اتنی راس آئی ہے کہ انھوں نے اٹک شہر سے باہر کبھی قدم تک نہیں رکھا۔ ان کے ایک پرانے شناسا جناب وقار بن الٰہی بھی یہ کہنے مجبور ہوئے:

''حقیقت یہ کہ ہم نے چودھری صاحب کو اور چودھری صاحب نے ہمیں ہمیشہ دل کے قریب سمجھا۔ کبھی آنا جانا ہوا تو ان سے ملاقات ہوگئی اور بس۔ وہ تو کبھی کیمپبل پور سے باہر نکلے ہی نہیں [شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ حضرو کس سمت میں ہے''۔[۱]

یہ بات شاید بحیثیت مجموعی درست ہو، مگر مستثنیات بھی ہیں۔ جناب نذر صابری نے نہ صرف کئی دوسرے شہروں کے دورے کیے، بلکہ اپنے اسفار کی روداد یں بھی قلم بند کیں۔ یہاں تک کہ راقم الحروف بھی ایک بار حضرو ان کے ہمراہ گیا۔ جس کا ذکر انھوں نے یوں کیا ہے:

''جمال ہم نشیں کی کمپوزنگ کے دوران (میں) حضرو کی یاد نے بے قرار کیا۔ ۱۸/ اگست کو شوکت محمود شوکتؔ کے ہمراہ حضرو روانہ ہوا۔ راشد علی زئی کو گھر سے اٹھایا اور ان راستوں پر چل دیا جن سے ۵۵ سال پہلے مولانا ربانی کی معیت میں گزرا تھا۔''[۲]

جناب نذر صابری نے جس شہر کا بھی سفر یا دورہ کیا، اس کی روداد نہ صرف اپنے روزنامچے میں ضبطِ تحریر میں لائے، بلکہ تفصیلی روداد الگ سے قلم بند کی۔ اگرچہ انھوں نے چند ہی سفر کیے، اور ان کی یادداشتیں لکھیں مگر یہ یادداشتیں اسلوب کے لحاظ سے انتہائی دلکش، خوبصورت اور سادہ ہیں۔

جناب نذر صابری کے یہ سفر احباب کی معیت میں ہوئے۔ غالباً ان کے لیے تن تنہا سفر کرنے میں زیادہ لطف نہیں ہوتا، نیز ان کے گنے چنے یہ سفر حضرو کے ہوں، یا پشاور اور دوسرے شہروں کے، ان سب میں بنیادی مقصد اچھی کتابوں کی تلاش کارفرما ہوتا ہے۔ ماضی کے میراثِ کتب سے ان کی دل چسپی نے جہاں ان سے کتابوں پر خرچ کرایا وہیں میراثِ کتب کی فہرست نگاری پر بھی مجبور کیا۔ انھوں نے اسلامیہ کالج کے کتب خانے کی زیارت کے لیے سفر کیا۔

اس سفر کی یادداشتوں [ایک یادگار سفر] سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ہم ۱۴ نومبر ۱۹۷۴ء کی صبح کو طے شدہ پروگرام کے مطابق پشاور کو روانہ ہوئے۔ چناب [ریل گاڑی] پر پہنچ نہ سکے۔ پروفیسر اشرف اور سید رفیق بخاری پہنچ گئے تھے۔ ہماری ایک تو گھڑی غلط کار ہوگئی ہے، دوسرے خواجہ محمد خان حضروی کے ناشتہ (ناشتے) کا کچھ کرنا تھا اس لیے دیر ہوگئی''۔ [۳]

اس سفر کے دوران میں حسن رہ گزر اور سرودِ ہمسایہ کو بزرگوں کی طرح جائز سمجھتے ہوئے ،انھوں نے حسن بے پروا کا ذکر بھی اپنے الفاظ میں کچھ یوں کیا ہے:

''ریل کار کا خرام اور اس کی موسیقی اپنی ہی (ہوتی) ہے، ہمارے کمرہ (کمرے) میں ایک جگہ کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں جنھوں نے پتلونیں کس رکھی تھیں اور جن کے سر کے بال سیاہ، لمبے اور آنکھیں بھی کالی تھیں۔ رنگ خوبصورت، نکھرا ہوا گورا اور خط وخال بھی جاذب، خاص کر ان میں سے بڑی لڑکی بہت حسین تھی۔'' [۴]

جب جناب نذر صابری اپنے دوستوں کے ہمراہ (پروفیسر اشرف، سید رفیق بخاری اور خواجہ محمد خان حضروی) پشاور کے ریلوے سٹیشن پر ریل گاڑی سے اترے، تو آپ سب پشاور کے ریلوے سٹیشن سے بس کے ذریعے اسلامیہ کالج کے کتب خانے پہنچے جہاں انھوں نے مختلف قلمی نسخے دیکھے اس کا تذکرہ آپ یوں کرتے ہیں:

''نائب کتاب دار ہمارے ہمراہ تھے انھوں نے ان نسخوں کا تعارف کروایا۔ نسخوں پر اردو، انگریزی ہر دو زبانوں میں ان کا تعارف لکھا ہوا سامنے تھا۔ پانچویں صدی ہجری کا نسخہ ان کے ہاں سب سے پرانا ہے۔ اس کا طرز تحریر مخصوص ہے۔ اس طرز تحریر کے کچھ اور نسخے بھی وہاں پڑے تھے جو ساتویں، آٹھویں صدی ہجری تک کے تھے۔'' [۵]

انہوں نے اپنے ذوق کتب بینی کی تسکین کے لیے اپنے دوستوں کے ہمراہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں کافی وقت گزارا۔ پشتو زبان کے ایسے مخطوطات بھی ان کی نظر میں آئے جن پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ بعد ازاں کچھ وقت پشاور صدر میں گزارا اور رات ساڑھے آٹھ بجے اٹک واپس آئے۔ جناب نذر صابری کا یہ سفر نامہ زیادہ طویل نہیں نیز اس میں قاری کے دل بستگی کا خاصا سامان ہے اور قاری اسے ایک نشست میں پڑھ سکتا ہے۔ اس سفر نامے میں جن علمی و تحقیقی موضوعات کی نشان دہی کی ہے، وہ نہایت اہم ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور کا کتب خانہ وطنِ عزیز کے ان چند کتب خانوں میں شامل جو اپنے خطی ذخیرے کے حوالے سے پورے عالم اسلام میں شہرت کے حامل ہیں۔ اسلامیہ کالج، پشاور کے کتب خانے کی دور و نزدیک شہرت کا ایک سبب یہ ہے کہ اس کی فہرست ۱۹۱۸ء میں ''لباب المعارف العلمیہ'' کے نام سے کتب خانے کے کتاب دار مولوی عبدالرحیم نے مرتب کر دی تھی، جو شائع ہوئی، جس کے منظر عام ہونے کے بعد، اہلِ علم اس کتب خانے سے استفادے کے لیے رجوع کرتے رہے۔

اس کے علاوہ جناب نذر صابری ، گڑھی افغاناں ،ضلع راولپنڈی کے کتب خانے فاضلیہ کی فہرست سازی کے لیے گھڑی افغاناں جاتے رہے، مگر کتب خانوں کی ذمہ داروں کی سرد مہری کی وجہ سے انھوں نے یہ کام ادھورا چھوڑ دیا۔ انھوں نے مکھڈ [ضلع اٹک] کے سفر کیے تا کہ مولانا محمد علی مکھڈی کے کتب خانہ [مکھڈ] کے مخطوطات اور مطبوعات کی فہرست بنائیں۔ میکی ڈھوک [فتح جنگ] کے خطی نسخوں کی زیارت کے لیے وہاں گئے، البتہ وہاں موجود کتب کی فہرست سازی کا کام سرانجام نہیں دیا۔ خواجہ محمد خان اسد حضروی کتب خانے ''میرا کتب خانہ'' اوراکوڑہ خٹک کے کتب خانے کے بھی کئی بار علمی سفر کیے۔ پروفیسر ڈاکٹر سعد اللہ کلیم کے ساتھ اسلام آباد کے تقریباً تمام کتب خانوں کے ذخائر کی چھان بین کی۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب نذر صابری نے کوئی بہت طویل سفر نہیں کیا، بیرونِ ملک تو انھیں کبھی جانے کا موقع نہیں ملا، اور تگ و تازِ سفر بھی ضلع اٹک کے ایک طرف پشاور تک اور دوسری طرف راولپنڈی اور اسلام آباد تک محدود رہی۔ نیز یہ سفر بھی چند گھنٹوں سے ایک دو روز تک محیط رہے، اس لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نذر صابری صاحب اٹک سے باہر نہیں گئے، تو وہ لفظی طور پر درست نہیں، لیکن ان کے ''اٹک گیر'' ہونے کی تائید بھی قائم رہتی ہے۔

❁❁

۱۔ مکتوب وقار بن الٰہی بنام مقالہ نگار [محررہ ۸ر جنوری ۲۰۰۸ء]

۲۔ نذر صابری، تذکرۂ مولانا غلام ربانی رمداسی چشتی صابری، اٹک: ادارۂ تجلیاتِ فروغِ صابریہ، ۲۰۰۳ء، ص ی۔

۳۔ نذر صابری، ایک یادگار سفر، ہفت روزہ رنگ صدف، حضرو [اٹک]، جلد ا شمارہ ا، ۲۴ تا ۳۱ جولائی ۲۰۰۲، ص ۳۔

۴۔ نذر صابری، ایک یادگار سفر، ہفت روزہ رنگ صدف، حضرو [اٹک]، جلد ا شمارہ ا، ۲۴ تا ۳۱ جولائی ۲۰۰۲، ص ۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۔

مشرف عالم ذوقی

کچھ مرگ انبوہ کے بارے میں

نالۂ شب گیر 2014 میں شائع ہوا تھا۔ مرگِ انبوہ 2019 میں۔ اس ناول کی تخلیق میں پانچ برس لگ گئے۔ ہندوستانی فکشن کے نقاد کا مزاج آج بھی مختلف ہے۔ نقاد عام طور پر سیاسی ناولوں کو صحافت سے منسوب کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے زیادہ تر شاہکار کا تعلق سیاست سے ہے۔ آپ روسی ادب کو ایک طرف کریں، اس کے باوجود وکٹر ھیوگو، اروندھتی رائے، احان پامک، گابریئل گارسیا مارخیز یہاں تک کہ نجیب محفوظ، سلمان رشدی، میلان کندیرا کے ناول میں بھی سیاست صاف طور پر نظر آتی ہے۔ کیا عالمی جنگ عظیم پر ناول تحریر نہیں ہوئے۔؟ اردو میں عالمی جنگ عظیم کی بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی۔ تھکا ہارا نقاد، بوجھل فلسفوں کے درمیان سانس لیتا ہے اور ان ناولوں کو پسند کرتا ہے جو ہجرت، ناستلجیا، داغ و میر کی زندگی پر مبنی ہوتے ہیں۔ حالات اور مستقبل کے اشارے ناول کا حصہ بنتے بھی ہیں تو ان کا کینوا اس محدود ہوتا ہے۔ کیا 2000 کے بعد کی جو زندگی یا سیاست ہمارے سامنے ہے، وہ لکھنے کا موضوع نہیں۔؟ سن 2000 کے بعد حالات بدلتے چلے گئے۔ گودھرا ہوا، سنامی آئی، اور ایک خاص مشن اور مشن کے لوگوں نے ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ 2014 کے بعد زندگی سنگین حالات کا شکار ہو گئی۔ تشدد میں اضافہ ہوا۔ مسلمان ہونا جرم بن گیا۔ مرگ انبوہ کے لیے میں نے ایک ایسی داستان کو حوالہ بنایا جس کے مرکز میں دو کردار گھومتے ہیں۔ ایک باپ اور ایک بیٹا۔ جنریشن گیپ۔ چھوٹی چھوٹی نفرتوں پر بڑی نفرتیں حاوی ہوتی چلی گئیں۔ ویلن ہیرو بن گیا۔ معصوم، گنہگار بن گئے۔ گنہگار پاور میں آ گئے۔ کیا اس سیاسی کھیل کو دیکھنے کا حق صرف احان پامک یا اروندھتی رائے کو ہے؟ آج کشمیر پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ ہم سب کچھ بھول کر نیند میں چلنے والی قوم بن چکے ہیں۔ ملک کاغذ پر بنا کمرہ نہیں ہوتا۔ اگر گھر کے ایک کمرے میں آگ لگی ہوئی ہے تو کوئی دوسرے کمرے میں چین کی نیند کیسے سو سکتا ہے۔؟ عظیم موسیقار اورفیس کے روحانی نغمے خاموش ہو گئے۔ ہم اس بھیڑ کا حصہ بن گئے، جہاں ہلاکت اور تشدد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس لیے

جینے کے لیے لکھنا تو پڑے گا، بولنا تو پڑے گا۔ منہ کھولنا تو پڑے گا۔ اس بات کا احساس دلانا ہوگا کہ ہم ابھی مُردوں میں شامل نہیں ہوئے۔

شدّت سے مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہماری پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟ صرف تنقید سے کویی مسلہ حل نہیں ہوتا۔ اور اسی لیے عملی میدان میں آنے سے زیادہ تر لوگ پناہ مانگتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلّق سے میری کئی کتابیں ہیں۔ اپنی قوم کے بارے میں سوچنا بھی گناہ یا جرم ہو گیا؟

ہندوستانی سرزمین پر مستقبل کے جو مناظر میں دیکھ رہا ہوں، وہ شاید ملی تنظیمیں ابھی بھی دیکھ نہیں رہی ہیں.. یا وہ اس خوش فہمی کی شکار ہیں کہ حالات اس سے زیادہ خراب نہیں ہو سکتے۔ اب تک نشانے پر مسلمان تھے اب مذہب بھی نشانے پر آ گیا ہے۔ ابھی بھی حالات بہتر نہیں اور مستقبل کے نام پر آئندہ جس تماشے کی شروعات ہو سکتی ہے، اس کو نظر انداز کرنا اپنی بربادی کو دعوت دینے جیسا ہے۔

ہم اس بات پر بھی غور کریں کہ کہیں انجانے میں ہم مخصوص نظریے یا مشن کی حمایت تو نہیں کر رہے؟

فسطائی طاقتیں انسانی نفسیات کا مطالعہ رکھتی ہیں۔ ہٹلر کے پاس بھی فدایین تھے۔ جو اسکے اشاروں پر ایک لمحے میں جان دے دیا کرتے تھے۔ ملک کے موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے بدتر ہوئے جا رہے ہیں۔ حکومت یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ حکومت کے پاس مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے ایک لمبی فہرست ہے۔ پھر ایک کے بعد دوسرا نشانہ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ بہت ہوشیاری سے اکثریت اور اقلیت کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حکومت کی فسطائی منطق کے سامنے آپ بے بس اور مجبور ہیں۔ ممکن ہے۔۔۔ کہا جائے۔۔۔ لاؤڈ اسپیکر پر ازان نہ دیں۔۔۔ محلے میں ایک مسجد کی جگہ تین مسجدیں کیوں؟ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی آپکو زیر کیا جائے گا۔ اور اگر آپ ایک جگہ شکست کھا گئے، تو آپ کو ہر جگہ شکست ملے گی۔

حکومت بننے کے ساتھ ہی پہلا حملہ ملک کے سیکولر اور لبرل کردار پر کیا تھا. دراصل فسطائی طاقتوں کو ان دو لفظوں سے ڈر محسوس ہوتا ہے۔ فسطائی طاقتیں پوری شدّت اور منصوبوں کے

ساتھ مذہب، مشترکہ وراثت اور تہذیب پر حملہ کر رہی ہیں۔

آزادی کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات — جدیدیت کا خیمہ خاموش رہا — 1984 ہوا۔ پھر 1992 — کوئی ہلچل اس خیمے میں نظر نہیں آئی — کچھ ہلکی پھلکی علامتی کہانیاں لکھ دی گئیں۔ 1992 کے بعد کا منظر نامہ دیکھ لیجئے — خاموشی کی روایت قائم ہے...... سیاسی عدم بیداری کی فضا قلم کے محافظ پیدا نہیں کرتی — جدیدیت کے علمبرداروں کو کوئی غرض نہیں کہ ملک کہاں جا رہا ہے — بیمار مریضوں، سوکھی انتڑیوں کے باسی مردہ قصّوں میں اگر زندگی کی حرارت نہیں تو یہ قصّے فقط الفاظ کی بھول بھلیاں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں — ترقی پسند زندہ مکالمے کرتے تھے — بیانات دیتے تھے۔ حق کے لیے جنگ کرتے تھے۔ 1992 کے بعد کا عام رویہ ہے کہ جدیدیت کو عام اذہان اور مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں۔ نیند میں سوئے ادیبوں پر آپ فخر کر سکتے ہیں تو کیجئے... لیکن وہ ادیب ہی کیا جسے بدلتے سیاسی منظر نامے کی چیخ سنائی نہ دے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی اٹھارہ سے بیس کروڑ کے درمیان ہے۔ خانہ جنگی ہوئی تو نقصان ملک کا ہوگا -- شام مشرق وسطیٰ کا ایک بڑا اور تاریخی ملک ہے۔ اس کے مغرب میں لبنان، جنوب مغرب میں فلسطین اور اسرائیل، جنوب میں اردن، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے۔ شام دنیا کے قدیم ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ موجودہ دور کا شام 1946 میں فرانس کے قبضے سے آزاد ہوا تھا۔ اس کی آبادی دو کروڑ تھی۔ اب یہ آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے قریب بتائی جا رہی ہے۔ 2011 میں شامی حکومت کے خلاف شروع ہونے والے پرامن مظاہرے کے بعد حالات پرتشدد ہو گئے - سات برسوں میں عالمی سیاست نے شام کی سرزمین کو بارود کے دھویں اور خون سے آلودہ کر دیا۔ ہندوستان کی زمین شام نہیں بن سکتی۔

نفرت کا حل نفرت نہیں۔ میں یہ دیکھ کر گہرے سنّاٹے میں ہوں کہ کچھ ادیب بھی نفرت کو ہوا دینے میں پیش پیش ہیں۔ ایسے حالات میں جب ادیبوں کو اپنی ذمے داری ادا کرنی چاہیے، وہ غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہم اس سیاست سے واقف ہیں کہ جنگوں کو بہانا کیوں بنایا جاتا ہے؟ دوستی اور محبت بھری باتوں کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے... یہ کام ہم مل کر بہ خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ملک ایک نئی صورتحال سے گزر رہا ہے۔ مجسمے توڑے جا رہے ہیں۔ فسطائیت کا غلبہ ہے۔ مسلم مخالف رنگ شدید ہو چکا ہے۔ ان کے منصوبے خطرناک ہیں۔ ملک

ہندوستان کو شام بنانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔اب یہ ملک زعفران ہے مگران کی نظر میں۔ہم اس ملک کو زعفرانی نہیں ہونے دیں گے۔ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ جمہوری قدروں پر یقین رکھتا ہے لیکن اس وقت وہ بھی خوفزدہ ہے۔

وائرس کی ہماری مہذب دنیا میں ہزاروں قسمیں ہیں.کچھ وائرس جانوروں سے ہمارے درمیان آتے ہیں۔جانور اگر انسان کو کاٹ لے تو یہ وائرس انسانی خون میں شامل ہو جاتا ہے۔..ان دنوں تیزی سے یہ وائرس ہمارے ملک کی مسلم آبادی میں پھیل رہا ہے......تاریخ نے اکثر یہ سوال پوچھا ہے کہ ہٹلر جیسے حکمرانوں کو کیا خوف محسوس نہیں ہوتا؟ ہٹلر جیسے لوگ ہماری ہنستی مسکراتی دنیا کو اندھیر نگری میں تبدیل کر دیتے ہیں..ایسا ہر اس ملک میں ہوا جہاں بھی ہٹلر کی حکومت رہی..لیکن علم نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہٹلر جیسے لوگ بچوں سے بھی کہیں زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں...اور سب سے اہم بات..تمام تاناشاہ سوالوں سے ڈرتے ہیں.کیونکہ ظلم و جبر کی ہر انتہا تک پہنچنے کے باوجود انکے پاس جواب نہیں ہوتا..

آج ہم دنیا کے سب سے خوفناک تماشے کی زد میں ہیں..اس تماشا سے الگ وائرس ہر جگہ .ہر گلی..ہر سڑک..یہاں تک کہ آپ کے گھر میں بھی موجود ہے......اس وائرس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس آپکو بننا ہوگا..ورنہ تاریخ آپکو بھی کبھی معاف نہیں کرے گی جنگیں زخمی کرتی ہیں۔جنگوں کا خیال زخمی کرتا ہے.اور اس ماحول میں،اس خوفناک فضا میں محبّت کی آہٹ بھی دور تک سنائی نہیں دیتی...جہاں موت ہر گام آپ کے پیچھے ہو،جہاں آپکو دنیا کی نظر میں دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہو،وہاں کتنی عجیب بات کہ اسی دہشت گرد پر مصیبت کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں--اس دہشت گرد کو جلاوطنی کی سزا مل رہی ہے....ہم ہی نشانہ ہیں..ٹارگٹ صرف ہم..ہم ابھی بھی ظلم و جبر کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے خود کو محفوظ تصور کر رہے ہیں--

ایک بڑی طاقت میڈیا ہے جو آپکے جذبات،آپکے مذہب،آپکی شریعت کے پرخچے اڑانے کے لیے تیار اس لیے بیٹھا ہے کہ اسے مسلمانوں کو رسوا کرنے کی منہ مانگی قیمت مل چکی ہے۔ہم اپنے اپنے حجرے میں سمٹے ہوئے کہیں بھی آسانی سے فروخت ہو جاتے ہیں..کہیں آواز بلند کرتے بھی ہیں تو یہ آواز صحرا میں گم ہو جاتی ہے..صدمہ اس بات کا بھی ہے کہ ہم حکومت کی نظروں میں آسان ٹارگیٹ ہیں.یہ حکومت دو فی صد سکھوں اور ایک فی صد سے بھی کم جاٹوں سے

گھبرا جاتی ہے .ہم ابھی تک سکھوں اور دلتوں کو اپنے قریب نہیں کر پائے۔ان حالات میں مسلمانوں کے مستقبل کے آگے جو خطرہ منڈرا رہا ہے، اس سے باہر نکلنے کا ہر راستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے.. ہم یہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آنے والے وقت میں فسادات بھی ہم پر مسلط کیے جائیں گے۔بڑھتی بے روزگاری اور بھوکے مرنے کے باوجود اکثریتی جماعت کو ہندو راشٹر کا کھلونا تھما دیا گیا ہے۔ مودی حکومت پہلے ہی مسلمانوں کے لیے بے نامی جایئداد کا قانون بنا کر بہت حد تک انکے راستے کو بند کر چکے ہیں۔اراضی کا مسلہ اٹھا کر مستقبل میں دوسرے مقاصد بھی سادھے جا سکتے ہیں اور ایسی تمام پہل سے نقصان مسلمانوں کا ہی ہوگا۔

میری سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ ملک اور اقلیتوں کا کیا ہوگا؟ نوٹ بندی ہو یا جی ایس ٹی سے جس کی کمر سب سے زیادہ ٹوٹے گی ، وہ مسلمان ہوں گے۔معاشی اعتبار سے جو سب سے زیادہ ذبح کیا جائے گا، وہ بھی مسلمان ہوں گے۔اس ملک میں مشن کی سوچ کی پہلی منزل مسلمان ہیں۔اور اسی لیے مشن بار بار یہ بیان دیتی آئی ہے کہ اس ملک کے تمام مسلمان کنورٹیڈ ہیں۔اور یہ بیان بھی برسوں سے دیتی آئی ہے کہ اس کی دشمنی مسلمانوں سے نہیں، اسلامی فکر رکھنے والوں سے ہے۔کیونکہ ایک دن مسلمانوں کی گھر واپسی ہو کر رہے گی۔

2014 کے بعد کے سیاسی منظر نامہ پر غور کریں تو مسلمانوں کے لیے ہر دوسرا دن ، پہلے دن سے زیادہ بھیانک ثابت ہوا ہے۔ان 5 برسوں میں مسلمانوں کو ہلاک کرنے والے، فرضی انکاؤنٹر کرنے والے، مسجدیں شہید کرنے والے، کریمنل ریکارڈ والے تمام مجرم جیل سے بری کر دیے گئے ۔ اور معصوم مسلمانوں پر جیل کی سلاخیں سخت ہوگئیں۔آسمان میں ناچتے گدھ شکاری بن گئے کہ کیسے مسلمانوں کا شکار کیا جائے۔نئے نئے طریقے ایجاد کیے جانے لگے۔

۔مسلمان سبز اسلامی پرچم لہرائے تو وہ پاکستان کا جھنڈا ہو جاتا ہے ۔۔ہر دوسرے دن ایک بیان مشن کے کسی نہ کسی لیڈر کی طرف سے آجاتا ہے، جس میں صاف صاف اور کھل کر یہ بات کہی گئی ہوتی ہے کہ مسلمان ملک دشمن ہیں۔

۔بار بار مسلمانوں سے یہ صفائی مانگی جاتی ہے کہ وہ حب الوطن ہونے کا ثبوت پیش کریں۔اور ثبوت کے طور پر دادری میں رہنے والے محمد اخلاق کی فریج کا مٹن، بیف بن جاتا ہے۔المیہ......المیہ کہ اپنی حد میں رہنے والے، قانون کا پاس رکھنے والے محمد اخلاق کی فریج میں رکھے مٹن کو عدلیہ بھی

بیف ثابت کرنے پر تل جاتی ہے۔

اخلاق اور تبریز بے دردی اور بے رحمی سے ذبح کردئے جاتے ہیں۔

۔۔۔۔۔پہلو خان بھی ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ ہاتھ میں ترشول لیے خوفناک چہروں والے گئو رکشک دھوکہ سے مسلمانوں کو ہندوستان کے ہر صوبے میں قتل کرنے کے بہانے تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔حکومت چپ۔انصاف چپ۔عدلیہ چپ۔ غلطی سے کسی ایک مسلمان سے کوئی ایک معمولی سا جرم بھی سرزد ہوجائے تو میڈیا اسے غدار اور دشمن بنا کر چلانے لگتا ہے ۔ہندو سبھاؤں نے دیواروں پر اسطرح کے بینر لگائے کہ 2200 مسلمانوں کی لڑکیوں کو اپنی بہو بنانا ہے مگر کوئی آواز نہیں اٹھی۔سب چپ۔ترشول دھاریوں کو،غیر مسلم قاتلوں کو پوری چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ہم ایک ایسے پر آشوب وقت میں داخل ہو چکے ہیں کہ آسمان پر اڑتے ہوئے اور زمین پر گھومتے ہوئے شکاری ہر طرف، ہر جگہ دلت اور مسلمانوں کے فراق میں ہیں۔نشانے پر دلت اور مسلمان ہیں۔

گاندھی مرنے کے بعد بھی زندہ تھے۔گوڈسے اسی دن مر گیا جس دن اس نے گاندھی کو مار ڈالا۔ایک خوبصورت اور مہذب دنیا یہ سوچ کر خوش ہوتی رہی کہ گاندھی کسی انسان نہیں آئیڈیا لوجی کا نام ہے .انسان مرتا ہے،آئیڈیا لوجی زندہ رہتی ہے۔لیکن کیا یہ محض خوش فہمی ہے؟ کیا گاندھی کو مارنا،بہتّر برس بعد جلاوطن کرنا آسان ہے؟ وہ خوش ہیں کہ میڈیا،اخبارات،سرکش اور اشتعال انگیز بیانات کا سہارا لے کر انہوں نے گوڈسے کا مندر تک بنا دیا۔کیا یہ انکی بھول ہے کہ گاندھی ہر روشن دل میں کل بھی زندہ تھا،آج بھی زندہ ہے ..؟ جنگ اور تشدد سے پیدا شدہ تباہیوں سے گاندھی نے یہ سیکھا کہ آزادی کے لیے عدم تشدد کا فلسفہ لے کر آ گئے اور حکومت برطانیہ کے ساتھ عالمی سیاست کو بھی حیران ہونا پڑا کہ وہ قیادت کی اس نئی رسم سے واقف نہیں تھی۔عدم تشدد کا فلسفہ ایسا ہتھیار ثابت ہوا کہ فرنگی گاندھی اور انکے نظریات سے خوف محسوس کرنے لگے ... کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ ساؤتھ افریقہ کا سوٹڈ بوٹڈ بیرسٹر گاندھی جب اپنے ملک ہندوستان آئے گا.. تو سب سے پہلے وہ ہندوستانی شناخت کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کے دور دراز گاؤں کا دورہ کریگا .. کیونکہ آج بھی اصل ہندوستان کی روح کا رشتہ گاؤں سے ہے ... ہندوستان کی ثقافت اور جڑوں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد موہن داس کرم چند گاندھی نے اس

روٹس کو محسوس کر لیا جس کی جڑیں ہر ہندوستانی کے دل تک پھیلی ہوئی تھیں ... یہ حقیقت ہے کہ گاندھی نہ آتے تو حکومت برطانیہ کا تسلط کبھی ختم نہ ہوتا... اب ایک نیئے گاندھی کا جنم ہوا۔ جس نے سو دیشی کا نعرہ دیا... خود چرخہ لے کر بیٹھا.. سوٹ بوٹ اتار پھیکا.. اپنے لباس، سوٹ کے دھاگوں سے تیار کرنے لگا... یہاں تک کہ کستور با کو بھی اپنے مشن میں شامل کر لیا...... یہ گاندھی کا مشن تھا.. کہ ہندوستانی انگریزوں کی بنائی چیزوں سے فاصلہ رکھیں گے ... نمک بھی تیار کرینگے ... اپنے لباس کے لیے اپنے ہاتھوں کے محتاج ہونگے ... حکومت برطانیہ کے ظلم کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے .. عدم تشدد کا سہارا لے کر انھیں شکست دینگے ... یہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ہوا جب چرچل کے نیم عریاں فقیر کے جذبے، ضد اور فلسفوں نے حکومت برطانیہ کو جھکنے پر مجبور کر دیا ......آزادی کے ساتھ ملک کو بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کا تحفہ ملا.. جب ملک آزادی کا جشن منا رہا تھا، گاندھی نواکھلی میں متاثرین کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے بھوک ہرتال پر بیٹھے تھے ... گاندھی جسے اقتدار کا کوئی نشہ نہیں تھا.. ہے رام کہتے ہوئے جس نے آرام سے گوڈسے کے پستول سے نکلنے والی گولیوں کو قبول کر لیا......اقتدار کے بھوکے سماج میں کیا آج کے دور میں کسی گاندھی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

یہ اس ملک کی موت ہے جہاں گاندھی کی ناقدری کے بعد بھی عوام خاموش ہے ... جہاں پہلے گوڈسے کی نمائندگی کرنے والے گاندھی کی آنکھوں سے عینک اتارتے ہیں پھر گوڈسے کو عینک پہنانے کی کوشش کرتے ہیں.. یہ یاد رکھیے کہ ان چار برسوں میں گوڈسے کے مندر بھی بنتے رہے ہیں.. مندروں میں باضابطہ پوجا بھی ہوتی رہی ہے .. بھکتوں کا آنا جانا بھی رہا ہے. پہلے گوڈسے کے نام پر خاموش ہو جانے والے اب سینہ تان کر گوڈسے کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ انکے پاس اقتدار کی طاقت ہے۔ ایسی طاقت جہاں دلیلیں کام نہیں آتیں...

انسان کی موت کو گاندھی مذہب اور تقسیم کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا تھا......وہ چرخہ چلاتا تھا .. وہ کھادی سے اپنے کپڑے بنتا تھا.. وہ ایک نئے ہندوستان کا خواب دیکھتا تھا. اسے اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہیے تھا.... وہ محبت کی ایک روشن مثال بن چکا تھا... ایک مضبوطی .. یہ نام ہمیں شکست کے ماحول میں حوصلہ دیتا تھا.. یہ نام قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ایک مثال تھا... آج اس نام کو گوڈسے کی ذہنیت والوں نے روند دیا ہے... انگریز بھی گاندھی کی عظمت کے

قایل تھے... آج گاندھی کی عظمت سے انکار کرتے ہوئے کچھ شر پسند لیڈران یہاں تک کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم گاندھی کو ملک سے نکال باہر کرینگے ۔ملک خاموش ہے .... کیا ملک نے گاندھی کی موت کے جشن کے لیے خود کو تیار کرلیا ہے؟ کیا گاندھی کے بغیر آزادی اور ملک کا کوئی تصور باقی رہ سکتا ہے ...؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ گوڈسے کے حمایتی ہماری قوت برداشت کا امتحان لے رہے ہوں... ہماری خاموشی ہماری ناکامی ہی گوڈسے کی جیت ہے۔

ملک کا نوے فیصد میڈیا ہندو راشٹر کی بحالی کے لیے مسلمانوں کے خلاف ہے۔آسٹریلیا میں جب ایک اخبار نے کچھ برس قبل مسلمانوں کے خلاف لکھا تو وہاں کے تمام اخبار مسلمانوں کی حمایت میں آ گئے ۔انگلینڈ اور امریکہ میں یہی منظرنامہ ہے۔لیکن ہندوستانی منظرنامہ یہ ہے کہ آج ہونے والے تمام فسادات اور اشتعال انگیزیوں کے پیچھے اکیلا میڈیا ہے جو ہندو سیناؤں کو مسلسل، مسلمانوں کو برباد کرنے کی ٹریننگ دے رہا ہے۔سب کچھ کھلے عام ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے؟ کس کے اشارے پر ہو رہا ہے؟ یہ ملک کہاں جا رہا ہے؟

اس وقت ملک کے صفحہ پر مسلمانوں کے خون سے جو کہانی لکھی جا رہی ہے .اسے روکنا ہوگا .۔اشتعال انگیز بیانات اور روز روز ہونے والی ہلاکت کے قصّوں کو ختم کرنا ہوگا لیکن کیا یہ آسان ہے؟ ۔۔آپ ڈریں گے تو حکومت ڈرائے گی ۔آپ جس دن ڈرنا چھوڑ دیں گے، اس دن سے حکومت ڈرنے لگے گی نفسیات کا یہ معمولی نکتہ ہے کہ ہر ہٹلر اندر سے کمزور ہوتا ہے .وہ مجمع میں دہاڑتا ہے۔سچ بولنے والے ایک معمولی سے آدمی سے بھی وہ ڈر جاتا ہے۔

میڈیا، ٹی وی چینلس اور حکومت نے مسلمانوں کو دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی مخلوق گردانا شروع کر دیا ہے .ایک ایسی مخلوق جسے بس اس سرزمین سے باہر نکالنا باقی رہ گیا ہے .آنکھیں بدل گئی ہیں .کچھ دن اسی طرح گزرے تو مسلمان اس ملک میں نمائش کی چیز بن کر رہ جاینگے .. دیکھو .. وہ جا رہا ہے مسلمان .. یہ ہونے جا رہا ہے .سوالات کے رخ خطرناک طور پر مسلمانوں کے لیے مایوسی کی فضا تیار کر رہے ہیں ... ہندوستان کی مقدّس سرزمین نفرت کی متحمل نہیں ہوسکتی .. اور .۔۔ مشن اپنے نظریہ میں تبدیلی لائے، یہ ممکن نہیں... اس ناول کے لکھنے کے دوران ایک حادثہ اور پیش آیا۔(وقت کے ساتھ اب یہ کہانی بھی تبدیل ہوچکی ہے) چار جج آزادی کے ستر برس بعد ایک ایسی دردناک کہانی کے گواہ بن گئے ، کہ اس کہانی کو قلمبند کرتے

ہوئے ذہن و دماغ میں دور تک سناٹا طاری ہے۔ کویی بم نہیں پھٹا ۔۔ یہ کویی فلمی کہانی بھی نہیں تھی .عدالت میں فیصلے سنائے جارہے تھے۔عدالت کو درمیان میں روک کر تین جج اپنے مقام سے اٹھے۔اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ ایک فون آیا۔ضمیر کی آواز کو لبیک کہا گیا۔اور یہ چار جج ، پانچ برسوں کی خوفناک دہشت کے گواہ بن گئے ۔ہندوستان کی سپریم کورٹ کے چار سینیئر ترین ججوں نے پریس کانفرنس کر کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اتھارٹی کو چیلنج کیا.جب جب انصاف کی تاریخ لکھی جائے گی ،جسٹس جے چلا سپیشمر ،جسٹس مدن لوکر اور جسٹس کرین جوزف کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔اس موقع پر ان ججوں نے جو بیان جاری کیا ،وہ تاریخ کی کتاب اور انصاف کے باب میں ایک ایسا اضافہ ہے، جسے مہذب دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔لا سپیشمر نے کہا 'ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر سپرم کورٹ کا وقار مجروح ہوا تو اس ملک میں جمہوریت نہیں بچ سکے گی اور نہ ہی کسی اور ملک میں۔اس بیان کا سب سے مضبوط حصّہ وہ ہے،جس میں کہا گیا کہ ہم نہیں چاہتے کہ 20 سال بعد اس ملک کی تارخ لکھی جائے تو یہ کہا جائے ، چلا سپیشمر ، مدن لوکر اور کرین جوزف نے اپنا ضمیر بیچ دیا تھا۔

سوال بہت سے ہیں .ہندوستان کے چوراہوں اور دیواروں پر صرف یہ عبارت لکھی جانی باقی ہے کہ ہندو راشٹر میں آپ کا سواگت ہے۔مسلمانوں اور دلتوں کا قتل ، ہر روز نئے مظالم ، صرف میڈیا کی آنکھ بند ہے .اس لیے کہ مکمل میڈیا خریدا جا چکا ہے .حکومت ہر شعبہ کو خرید چکی ہے .انصاف کی عمارت پر بھی زعفرانی پرچم چند دہشت گرد لہرا چکے ہیں..ادب ادیب صحافیوں کی بولی لگ رہی ہے۔زعفرانی ادیبوں کی نئی جماعت سامنے آ چکی ہے..

۲۰۰۲ تک ہندستانی سماج اس مقام تک نہیں پہنچا تھا، جہاں وہ اب پہنچتا نظر آ رہا ہے۔ اس کا جائزہ یوں لیا جا سکتا ہے کہ اڈوانی کی رتھ یاتراؤں کے بعد ہندستان میں نفرت کے تخم تو بوئے گئے لیکن پھر بھی خطرہ بہت زیادہ نہیں تھا۔بابری مسجد شہید ہو گئی تو ایک طبقہ خوش ہو گیا کہ چلو، ہماری جیت ہو گئی اور وہ بس اتنے میں خوش ہو کر بیٹھ گیا۔2000 تک صورتحال نارمل رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان سے عراق اور افغانستان تک یہ مسلمان ہی تھا، جسے دہشت گرد کے طور پر نئی شناخت مل چکی تھی۔اور حکومتیں بھی مسلمانوں کی شناخت اسی دہشت پسند چہرے سے کر رہی تھیں۔مشن اس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے کہ وہ جس قدر مسلمانوں کے خلاف جائیں

گے، ہندو راشٹر کا راستہ آسان ہوتا جائے گا۔

ان سوالوں سے پردہ پوشی ممکن نہیں۔ سیاست سے فرار نہیں، سیاست سے وابستہ ہونا ہوگا۔ سیاست کے تمام اتار چڑھاؤ کو سمجھنا ہوگا۔ اس جڑ کو بھی جہاں سے نفرتیں پید ہو رہی ہیں۔ مستقبل کو بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ سلگتی ہوئی آگ کہاں تک جائے گی۔ اس کے بعد اس موضوع سے کچھ الگ ،مگر فسطائی طاقتوں کو لے کر میں نے ایک دوسرے ناول 'ہائی وہ پر کھڑا آدمی' کی شروعات کی ہے۔

مجھے آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

جمیل احمد عدیل

مائیکروفکشن کانفرنس کا پہلا سیشن: ایک زرخیز نشست

مائیکروفکشن کو اپنے بطون میں زرخیزی کی ثروت فراواں میسر ہے وگرنہ اس کی متعدد جہات ایک طویل نشست کا موضوع نہ بن پاتیں ____ امکانات کی مقدار کسی صنف کی حیات کا تعین کرنے میں حیران کن معاونت کرتی ہے ____ ساہیوال میں منعقدہ مذکورہ کانفرنس کے نمایاں شرکائے گفتگو میں: جناب حمید قیصر، محترمہ طلعت زہرا، جناب محمد فاروق اکمل، محترمہ فرحین جمال چودھری، ڈاکٹر فضیلت بانو، ڈاکٹر ریاض ہمدانی صاحب، سید تحسین گیلانی، عزیزم منیر عباس سپرا، شہزاد شاکر طور اور نیلم احمد بشیر کے اسما شامل ہیں۔ فکشن کی اس فرع کے تعلق میں پڑھے جانے والے مقالات اور تقاریر کو بغور سننے کا موقع ملا تو واپسی پر ذہن میں مذکورہ موضوع کی مناسبت سے مالہ و ماعلیہ نے چند ترتیبیں بنانے کی مساعی کیں؛ یوں ایک نوع کی حدیثِ نفس ایکٹو ہو گئی؛ جس کا اساسی سوال یہی ہے کہ سب سے پہلے مائیکروفکشن کو ایک حد تک ڈیفائن کر لیا جائے ____ تسمیہ غالباً زیادہ اہم نہیں ____ عام سوچ اسے 'افسانے کی مختصر صورت' قرار دینے تک رسائی رکھتی ہے جبکہ ایسا نہیں، اس لیے کہ 'مختصر' یا 'طویل' ہونا یکسر اضافی امر ہے۔ عوامل کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک فرد بیس صفحے کی کہانی کو بھی 'مختصر' گردان سکتا ہے؛ دوسرے کی نظر میں دو صفحے کی قرات بھی بار ہو سکتی ہے؛ اس طرح 'مائیکروف' کو میکانیکی سطح پر کسی پھیلے ہوئے بیانیے کا محض ملخص کہنا درست نتیجے سے ہمکنار نہیں کرے گا!!

فکشن سے وابستہ اصناف نے اپنے تعینات اور شناخت کے لیے داخلی ہیئتوں پر اصرار کیا ہے اور بجا کیا ہے۔ جہاں محض 'ڈاؤن سائزنگ' کی کاریگری دکھائی گئی ہے وہاں الگ پہچان کا وجود اپنا ہونا منوا نہیں سکا۔ ہاں! بادی النظر میں 'مائیکروف' کا اختصار ہی فوری طور پر سامنے آتا

ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے ناولٹ کی بابت بات کرتے ہوئے عمدہ مثال مہیا کی تھی کہ گرامر کی رو سے ناولٹ، ناول کی تصغیر سہی لیکن اس کو مرد کی مشابہت پر بچہ نہیں سمجھا جا سکتا۔یہیں سے روشنی لے کر اس مضمون کی تفہیم ہو سکتی ہے کہ 'مائیکروف' کا جداگانہ تشخص اس کے: موضوع، مواد، اسلوب، تکنیک اور ٹریٹمنٹ سے ہوگا نہ کہ اس کی مجرد 'مصغر حالت' سے۔ مانا کہ بڑے فکشن رائیٹرز مائیکروف کی جانب توجہ کر رہے ہیں؛ تسلیم کہ اردو میں اسے رائج کرنے کی کوششیں ثمر آور ثابت ہو رہی ہیں: لیکن جب تک ایک مائیکروف اپنا جواز اس اساس پر فراہم نہیں کر پاتا کہ: یہ حقیقت، یہ واقعہ، یہ خیال۔۔۔بجز مائیکروف کے کسی اور ''صنفِ فکشن'' میں بیان ہی نہیں ہو سکتے تھے؛ اس وقت تک اسے مضبوط بنیاد نصیب نہیں ہو سکے گی۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید صنعتی عہد میں مختصر نویسی نے واقعتاً ایک تقاضے کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن اس سوال کا جواب شاید ایسا سہل نہ ہو کہ ایک داستان اگر اپنی ضخامت میں ناول سے کہیں کم ہو تو کیا کیا جائے گا؟ ظاہر ہے ہمیں پھر یہاں رکنا پڑے گا کہ داستان کا مافوق الفطرت، تخیلاتی بل کہ 'غیر حقیقی' ہونا نیز اس کے ضمنی قصوں کا بکھیڑا اصل قضیہ ہے ___ باقی یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ کیا کسی صنف کے اصول وضوابط پہلے سے وضع کر کے اسے مروج کیا جا سکتا ہے؟ لیکن مائیکروف کے حق میں سب سے طاقتور دلیل بہر حیث یہ موجود رہے گی کہ اصناف نظم و نثر الہامی نہیں ہیں، نہ ان کے پیراڈائمز حتمیت کی فصیلوں میں مقید ہیں۔اگر دستور ترمیم آشنا نہ رہے تو بلاشبہ کچھ عرصہ تلک وہ اپنی حفاظت آپ کرتا رہتا ہے مگر م آل کار موت اس کی تقدیر بن کر رہتی ہے!!اور یہ 'م آل کار' بہر حال صدیوں پر محیط نہیں ہوتا!! سو تعریف کا محاصرہ اس قدر شدید نہ ہو کہ ہر کمک بند کر کے اسے فنا کی طرف دھکیل دیا جائے۔ یہ فطری لچک ہے جو اسے جاری رہنے کے انعام سے فیضیاب کرے گی۔اصولی سطح پر مائیکروف کا راستا روکا نہیں جا سکتا، البتہ مستقبل میں اس کی باطنی زیست نے اپنی بقا کا ثبوت دینا ہے۔

راقم خلاق ہونے کا مدعی نہیں، نہ آئین ساز ہونے کا ادعا لاحق ہے لیکن ایک طالب علم کے طور پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس فکشن رائیٹر کی اس اہم صنف سے ذہنی مطابقت ہے، وہ چند

جہتیں سامنے رکھے تو شاید بہتر رہے گا:

1- فکشن کا اساسی عنصر منہا نہ ہو۔

2- اگر معانی پھیلاؤ پر آمادہ نہیں ہیں تو الفاظ کا سمٹاؤ نری پری مشقت ہی قرار پائے گی۔

3- مائیکروف کا 'پیس آف لٹریچر' بننا ناگزیر ہے اور وہ اس کی تخلیقی توانائی کے متکلم ہونے سے جڑا ہوا عمل ہے۔

4- مائیکروف کا متن Un said کی صفت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں رکھتا تو مشکل آن پڑے گی، اسی مقام پر ایک سے زائد پرت کے قضایا کا کٹھن مرحلہ آغاز ہوتا ہے کہ جس ان کہی اور شیڈ کے جداگانہ پہلو سے اس کے وجود نے آباد ہونا ہے، اس تک ہما شما کی رسائی بازیچہ اطفال نہیں ہوگی۔ ہاں! ایک ہی خواندگی کے خوگر آرام سے سٹک جانے میں عافیت جانیں گے لیکن قرات کا ذوق رکھنے والوں کے فکرونظر میں متعدد اکناف نے نشوونما کے مراحل سے گزرتے رہنا ہے، تادیر۔

5- فی الوقت یہ عاجز مائیکروف کو: رمزیت، ایمائیت، اشاریت، اخفا اور استتار سے جدا نہیں کر پا رہا ___ یوں علامت اور تجرید دونوں اس کی نشوونما میں کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس نکتے کی تصریح بے محل نہ ہوگی کہ مائیکروف کو کسی: واضح، قطعی اور متعین رنگ کی Solid State حاصل نہ ہونے میں ہی اس کی تفرید مضمر ہے؛ اس کو اعلا لطافت سے جدا کرنا لطف کو زائل کرنے کے مترادف ہوگا؛ اس کا امتیازی وصف سلب کرنے کے مساوی ہوگا۔

6- مائیکروفکشن کا نقاد اسے مانا جائے گا جو مائیکروف کی 'تقطیع' کر سکتا ہو۔

7- خیال ہے مائیکروف میں شامل ہو کر 'رموز او قاف' نصابی سطح سے اٹھ کر تخلیقی عمل مدار میں داخل ہو جائیں گے۔

8- آخری بات: مائیکروف کسی ذہنی ورزش کا عنوان نہیں ہے؛ نہ کم لفظوں

میں کہانی نویسی کا انعامی مقابلہ؛ اس کے قلب القلوب کا مرکزہ اپنی ماہیت میں موہوم کے مساوی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا منصب زندگی کی لطیف ترین صورتحال کو لطیف ترین بیانیے میں ڈھالنا ہے؛ جس نے نہایت محدود متن قاری کے سپرد کر کے اس کے وجود میں کہرام سا برپا کر دینا ہے؛ گویا مائیکروف تو مضراب ہے اور قاری کی روح ساز ہے۔ ● اب دیکھنا یہ ہے کہ مثالی مائیکروف کو مثالی قاری ملتا ہے یا نہیں؟ ہاں! یہ آرزو ضرور ہے کہ مائیکروف اپنی جگہ اس طرح بنائے کہ کبھی 'پاپولر لٹریچر' کی تہمت اس کا مقدر نہ بنے!!

لہٰذا اب مائیکروفکشن نگار اور اس کے قاری، دونوں نے ارتقائی مراحل طے کرنے ہیں اور ظاہر ہے ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جمائی جا سکتی!! یہ چنار کا درخت ہے، چلیے صدیاں نہ سہی، دہائیاں تو بیتیں گی!! لیکن اس باضابطہ طرف نے بہر طور مستحکم رہنا ہے کہ 'اصولی سہولت' میں قاری رہے گا، لکھاری، نہیں کہ مائیکروف رائیٹر نے کہیں زیادہ دشوار گزار جادے کا چناؤ کرنا ہے۔ یعنی عبارت میں Economy of Words اور Brevity وغیرہ ایسے اوصاف کی شمولیت پھر بڑے درجے کا کھیل نہیں ہے۔ اصل جادو خیال کے اعماق اور مضمون کی وسعتوں کو گزند سے بچانا ہے۔ بس برقی توانائی بنا کسی تخفیف کے Hole of Needle میں سے گزر جائے۔ ایسے میں سچ عریانی پر بھی نہ اترے، افسانے کی روح 'افسانہ پن' بھی قائم رہے!! ایک طرف اتنی آہن گداز جہد اور اس کے ہمراہ عدم تحفظ کا احساس، کیونکہ متداول صنف میں لکھنے والا Secure ہو کر لکھتا ہے، اسے صرف مظروف کا چیلنج درپیش ہوتا ہے، ظرف کا نہیں۔

اختتامی کلمے کے طور پر کانفرنس کے مرکزی منتظم اور اردو میں مائیکروفکشن کے بنیاد گزاروں میں شامل سید تحسین گیلانی سے قدرے بے تکلف ہو کر کہنا ہے: میرے عزیز! اس صنف کو سرد و گرم چشیدہ ہونے دو! مکالمہ ضرور جاری رکھو لیکن اس نوزائیدہ کو انکوبیٹر میں رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا، بھلے ہی مائیکروف کے آخر میں روف/ اوف کی صوت سے ''ادبی سرمایا دار'' بدک اٹھیں، دیکھو دیکھو! یہ تو نری پری اشتراکیت کی بازگشت ہے!!

- **''ابتدا میں یہاں دریا تھا۔ دریا سرک بن گیا۔ سڑک کی شاخیں ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ سڑک پہلے دریا تھی، اس لیے ہمیشہ بھوکی رہتی !!''**

یہ 'مائیکروف' پڑھتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ اس عاجز کے مقدمے کو عملی نظیر میسر آ گئی ہے_ جبکہ یہ مائیکروف نہیں، Ben Okri کے ناول: The Famished Road کی ابتدائی سطور ہیں___ آیئے مل کر کسی 'باقاعدہ مائیکروف' کی جستجو کریں!! تاہم مراد بر آنے تک قلب میں تر و تازہ ہو جانے والے محولہ بالا طلسم سے نور کشید کرتے رہنے میں کیا مضائقہ ہے!!!

ضلع اٹک کے افسانہ گاروں کے متعلق ارشد سیماب ملک کی تاریخی

دستاویز

جس سے اٹک کی ادبی تاریخ لکھنے والے استفادہ کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر)

نسائی جذباتیت کے ''بکھرے رنگ

جب ہم عورت ذات کو اُس کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو وہ بہت حد تک ہمیں ایک مجبور و مقہور یا بالفاظ دیگر مرد ستم گاری کی صورت میں نظر آتی ہے۔ مانا کہ ایک طویل جدوجہد کے بعد اُس نے مرد غالب معاشرے میں ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے لیکن آج کے اس سائنسی اور تکنیکی دور میں بھی عورت کے بنیادی مسائل اور اُس کی الجھنیں پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ بہت کم خوش نصیب والدین ایسے ہیں جو بیٹی کے پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے ہیں۔ آج بھی اکثر والدین بیٹیوں کی پیدائش پہ اندر ہی اندر کڑھتے ہیں۔ بیٹی کو وہ مسائلِ حیات اور تشویش کی علامت تصور کرتے ہیں۔ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے، اُس کی بہتر تعلیم وتربیت، اُس کی ملازمت، اُس کے اچھے گھر اور بر کی فکر اور پھر اُس کی پوری زندگی پر نظر دوڑائیں یا اُس کے مستقبل اور مختلف روپ کو ذہن میں رکھ کر سوچیں تو اُس سے جڑی سچائیاں آنسو بہانے اور دل تھام کے بیٹھ جانے پر مجبور کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا کے اس دور میں ہماری بہو بیٹیاں طرح طرح کے مسائل اور اُلجھنوں سے جوجھ رہی ہیں۔ موبائل فون کے غلط استعمال نے جہاں شرم وحیا پر کاری ضرب لگائی ہے تو وہیں تکنیکی جرائم میں اضافہ کیا ہے۔ تکنیکی جرائم سے میری مراد یہ ہے کہ اب عام سیدھے سادے اور شریف لوگوں کو سماج کے کچھ ٹھگ، لُٹیرے، چور اور اوباش قسم کے لوگ موبائل فون پہ اُن کا اے ٹی ایم کارڈ نمبر اور کوڈ پوچھ کر روپے چرا لیتے ہیں۔ فیس بک اور واٹس ایپ کے ذریعے کئی طرح کی مجرمانہ حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ عورت ذات اپنے مختلف روپ میں کہیں نہ کہیں خوف، خدشہ اور استحصال کی شکار رہے یا پھر یوں بھی کہ سکتے ہیں کہ ہجر و وصال اور ذہنی خلفشار اُس کا مقدر بن کے رہ گیا ہے۔ بہت سے حساس والدین کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ بیٹیاں اگر پیدا ہوں تو اچھے مقدّر کے ساتھ پیدا ہوں۔ بیٹی کے روپ میں عورت ذات اپنے والدین کی خدمت گزار ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کی ناز برداری اور وفاداری میں لگ جاتی ہے۔ اُس کی خواہشوں کے احترام میں سولہ سنگھار کرتی ہے۔ اتنا ہی نہیں اُسے اپنے سسر ، ساس، دیور، دیورانی اور نندوں تک کو خوش رکھنے کی ریہرسل کرنی پڑتی ہے۔ اپنے گھر آنگن کو خوب صورت بنانے کی فکر میں پڑ جاتی ہے۔ ماں کے روپ میں وہ بہت زیادہ ٹوٹتی بکھرتی ہے۔ بچّے کو جنم دینے کے بعد وہ اُس کے بول و براز کو صاف کرتی ہے۔ اُس کی کلکاریاں سُنتی ہے تو اپنے

سارے رنج والم وقتی طور پر بھول جاتی ہے۔ایک خوشگوار اور کامیاب اذ دواجی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ میاں، بیوی کی طبعیتیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔

نسائی جذباتیت کے حوالے سے ایک ایسا افسانوں کا مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے جارہا ہے جس کا سرنامہ ''بکھرے رنگ'' ہے۔ڈاکٹر عقیلہ اس کی مصنفہ ہے۔اس میں دس افسانے شامل ہیں۔جن کے عنوانات قاری کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں مثلاً ''پیڑ کا جن'' ''بکھرے رنگ'' ''قاتل'' ''طلاق'' ''فریب'' ''آخر میں نے پالیا تجھے'' ''سزا'' ''چھوٹی سی محبت'' ''تحفہ'' اور'' انتظار'' ان تمام افسانوں میں عورت مختلف روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔وہ کہیں دوشیزہ ہے تو کہیں بیوی، کہیں ماں تو کہیں محبوبہ اور کہیں قاتلہ۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان افسانوں کی مصنفہ نے اپنے آس پاس کے ماحول کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ناموافق حالات وواقعات کی وقوع پذیری سے جو مسائل اور ذہنی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں اُن کو کہانی بند کرنے کی کوشش کی ہے۔دراصل ادبی تخلیق کار عام آدمی کے مقابلے میں بڑا حسّاس ہوتا ہے۔کسی واقعے یا حادثے سے جب وہ شدید طور پر متاثر ہوتا ہے تو اُسے فنی جامہ پہنانے کی تڑپ اُسے بے چین رکھتی ہے۔بالاخر جب یہ تڑپ شدت اختیار کرلیتی ہے تو تب اُسے فن پارے کی صورت میں قارئین کے سامنے لاتا ہے۔یہاں یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کی اصل روح تک پہنچنے کے لیے ان افسانوں کے موضوعات اور فنی برتاؤ پر بحوالہ گفتگو کی جائے۔

''پیڑ کا جن'' اپنے عنوان کے اعتبار سے اگرچہ علامتی نوعیت کا افسانہ ہے لیکن اس کی کہانی پورے بیانیہ انداز میں قاری کے دل میں شروع سے آخر تک ایک طرح کی گدگداہٹ سی پیدا کردیتی ہے۔اس افسانے کے ذریعے ایک بے بس ومجبور خاتون اپنے شوہر کی حاکمانہ ذہنیت اور مرعوبیت سے تنگ آکر بالآخر ایک جن کا ڈراما کر کے نجات پانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔برکت علی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہے وہ بیوی رقیہ بیگم کو بات بات پہ ڈانٹتا ہے جس کے باعث وہ تنگ آجاتی ہے اور اپنے شوہر کو راہِ راست پر لانے کے لیے جِن کا روپ دھارن کرکے اپنے میاں کی خوب پٹائی کرتی ہے۔ اپنے ڈرامائی کردار کے بعد وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ اُس کے شوہر کی انانیت اُس کے وجود سے رخصت ہوگئی ہے اور وہ راہِ راست پر آگیا ہے۔مثلاً مذکورہ افسانے کے اس اقتباس پہ دھیان دیجیے کہ جس میں رقیہ بیگم کی وفاداری اور برکت علی کے مزاج کی بیزاری کو مُصنفہ نے ایک راوی کی حیثیت سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''ویسے برکت علی کھانے کے بڑے شوقین تھے......اور رقیہ بیگم شوہر کی پسند کو نظر میں رکھتے ہوئے بڑی محنت،مشقت اور محبت سے بناتی اور گن گن کر سارے مسالے کھانے میں ڈالتی اور دسیوں بار چکھتی کہ کہیں کوئی کمی نہ

رہ جائے اور جب اُن کے سامنے پیش کرتی تو برکت علی ایک لُقمہ منہ میں ڈالتے پھر ٹیڑھا سا منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے تھوک دیتے' یہ کیا کھانا بنایا ہے؟ اتنے سال ہو گئے کھانا بناتے ہوئے ابھی تک تمھیں کھانا بنانا نہیں آیا۔ اس میں تو نمک ہی نہیں ہے'' اور کھانا چھوڑ کر اُٹھ جاتے۔ رقیہ بیگم برکت علی کی ان حرکتوں سے کافی پریشان تھیں...... سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ برکت علی کو کیسے راستے پر لایا جائے ۔تبھی رقیہ بیگم کو ایک آئڈیا آیا۔ شاید یہی ایک راستہ تھا برکت علی کو سُدھارنے کا'' یہ اصلاحی نوعیت کا افسانہ قاری کو یہ پیغام دیتا ہے کہ ایک پُرسکون ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے شوہر کے ذہن و دل میں حاکم ومحکوم کا کوئی بھی تصور نہیں ہونا چاہیے۔ ہر کام میں دونوں کی مشاورت ورفاقت نہایت ضروری ہے ورنہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے گھرانے میاں، بیوی کی نوک جھونک اور ذہنی ناہم آہنگی کے سبب برباد ہوئے ہیں۔

افسانہ'' بکھرے رنگ'' کا مطالعہ قاری کو چونکاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ سیما نام کی لڑکی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ غالب گمان ہے کہ ہمارے سماج میں کتنی ہی لڑکیاں شادی سے پہلے سیما کی طرح پس پردہ بدمعاش قسم کے لوگوں کے ہاتھوں عصمت دری اور جنسی ہوس کی شکار ہوتی ہوں گی۔ رات کی تنہائی اور تاریکی میں جب سیما کے گھر میں کالے کپڑے پہنے چہرے پہ کالا ماسک لگائے کوئی بدمعاش قسم کا آدمی داخل ہو کر سیما کی عزت وعصمت لوٹنے لگتا ہے تو وہ بے بسی کے عالم میں بہت چھٹپٹاتی ہے۔ روتی ہے لیکن درندہ صفت آدمی اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد بھاگ جاتا ہے۔ سیما جب اپنے ساتھ پیش آمدہ واقعے کی روداد روتے ہوئے اپنی ماں کو سُناتی ہے تو اس کا پتا سیما کے باپ کو بھی لگ جاتا ہے۔ باپ غصے کی حالت میں جونہی پولیس کو فون کرنے لگتا ہے تو سیما کی ماں رسیور ہاتھ سے چھڑا لیتی ہے محض اس لیے کہ ہماری بیٹی کے ماتھے پہ بدنامی کا کلنک لگ جائے گا۔ درج ذیل اقتباس کے حوالے سے کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کا بخوبی اندزاہ ہو جاتا ہے:''سیما نے بھرے گلے سے پوری تفصیل ماں کے سامنے بیان کر دی۔ پاپا نے پولیس کو کال کرنا چاہا تو ماں نے جھٹ سے اُن کے ہاتھ سے رسیور فون پر رکھتے ہوئے کہا'' یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ پولیس کو فون کرنے سے یہ بات پورے شہر میں پھیل جائے گی، جو بات اس وقت گھر کی چار دیواری میں ہے۔ اس میں ہماری اور ہماری بیٹی کی بدنامی ہو گی۔ اس لیے ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم خاموش رہیں'' اور سیما کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں سختی سے کہا'' اے لڑکی! خبردار یہ بات کبھی کسی کے سامنے کی تو''۔

یہاں ایک المناک تاثر ذہن ودل پہ چھا جاتا ہے کہ لڑکی اور لڑکی کے والدین بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتے، زخم کو دکھائیں تو بدنام ہوتے ہیں اور نہ دکھائیں تو اندر ہی اندر

درد کی ترنگ محسوس کرتے ہیں ۔ بالآخر سیما کی شادی آنند نام کے ایک لڑکے کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔ جو کالج کے زمانے سے ہی سیما کو بہت چاہتا تھا۔ افسانے کا اختتام تحیر آمیز ہے وہ اس لیے کہ سیما شب زفاف کے دوران اپنے شریک حیات آنند کو یہ بتا دیتی ہے کہ شادی سے پہلے ہی وہ اپنا گوہر عصمت لٹا چکی ہے لیکن اس کے باوجود آنند سیما کے ساتھ بڑے حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے۔ وہ دونوں خوشی خوشی ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔

افسانہ ''قاتل'' کا عنوان اگر قاتلہ رکھا گیا ہوتا تو بہتر رہتا کیونکہ یہاں ایک عورت قاتلہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے جو اپنے شرابی اور اوباش قسم کے شوہر سے تنگ آ کر اُس کو قتل کرنے کے بعد اُسے گھر کے ایک کمرے میں پُراسرار حالت میں رکھ دیتی ہے۔ شراب نے ہندوستانی سماج میں بہت سے گھروں کو اُجاڑا ہے۔ سدھا ایک ایسی عورت ہے جو گھر کے سارے کام کرنے کے بعد بھی اپنے شرابی شوہر رنبیر کے ہاتھوں زدوکوب ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی ہندو ناری ہے جو اپنے پتی کو دیوتا کی طرح دیکھنا چاہتی ہے لیکن اُس کا شوہر شراب اور شباب کا رسیا ہوتا ہے جو گھریلو ذمہ داریوں کے احساس سے عاری ہے۔ رنبیر کو قتل کرنے کے بعد جب پولیس سدھا کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور پوری تحقیقات کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ رنبیر کا قتل اُس کی اپنی بیوی سدھا نے کیا ہے یہ سب جانتے ہوئے بھی پولیس سدھا کو گرفتار نہیں کرتی کیونکہ پولیس کے کھانے پینے کا انتظام سدھا پہلے ہی کر چکی ہوتی ہے۔

افسانہ ''طلاق'' میں ایک طلاق شُدہ عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دانش مندوں کا قول ہے کہ جوش میں اگر آدمی ہوش سے کام نہ لے تو ساری عمر آدمی کو پچھتانا پڑتا ہے۔ شاداب اور پری اس افسانے کے دو مرکزی کردار ہیں۔ شاداب تلخ مزاج ہے جب کہ اُس کی بیوی پری، نرم مزاج اور پری پیکر ہے۔ دونوں کی شادی پیار و محبت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اُن کے والدین نہیں چاہتے کہ شاداب اور پری کی شادی ہو لیکن یہ دونوں عشقیہ جذبات سے مغلوب ہو کر کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ ایک روز جب پری سرکاری نوکری کے انٹرویو میں اپنی سلیکشن کی خوشخبری شاداب کو سناتی ہے تو شاداب اُس پہ خفا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ اُس کی بیوی سرکاری نوکری کرے۔ وہ غصے میں اُسے تین بار زبانی طلاق دے دیتا ہے۔ پری یہ سن کے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ طلاق دینے کے فوراً بعد شاداب اپنی غلطی پہ پچھتانا شروع کرتا ہے۔ رونے لگتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ پری سے معافی مانگنے لگتا ہے لیکن پری اُسے اپنے قریب آنے سے منع کرتی ہے یہ کہہ کر کہ وہ اب اُس کی بیوی نہیں رہی ہے۔ آخر کار حلالہ کرنے پر بات آ ٹھہرتی ہے لیکن حلالہ کس سے کروایا جائے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس شرعی مسلے کے لیے اُنھیں مولوی چاچا رحمت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاداب اپنی

بیوی پری کو چاچا رحمت کے پاس ایک رات کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔دوسرے دن جب وہ پری کو لینے مولوی چاچا رحمت کے فلیٹ پر جاتا ہے تو وہاں پہنچ کر اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی رحمت رات کو ہی نہ صرف فلیٹ بلکہ شہر چھوڑ کے کہیں چلا گیا ہے۔اس افسانے میں کہانی پن کے ساتھ ایک دلچسپ تجسس شروع سے آخر تک نظر آتا ہے۔اس افسانے کی قرات ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے اور ذہن ودل پہ یہ تاثر چھوڑتی ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔مولوی رحمت کا کردار ہمارے اعتقاد کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔طلاق کے بعد حلالہ ہماری نفسیاتی دُنیا میں ارتعاش سا پیدا کرتا ہے۔یہاں بھی ہمیں عورت ذات مردوں کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی نظر آتی ہے۔اسی افسانے کے حوالے سے یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ شاداب اور پری کی شادی پیار ومحبت کی بنیاد پر کورٹ میں ہوتی ہے لیکن بعد میں طلاق پر نوبت آجاتی ہے۔وہ دونوں اپنے والدین اور خاندان والوں کی پراوہ نہ کرتے ہوئے ایسا کر گزرتے ہیں۔عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کورٹ میریج یا لو میریج بعد میں میاں، بیوی کے درمیان تکرار اور چڑچڑاپن پیدا کرتی ہے اور ایسی بہت سی شادیوں کا لرزہ خیز انجام طلاق کی صورت میں سامنے آتا ہے کیونکہ ایسی شادیاں والدین اور بزرگوں کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

افسانہ ''فریب'' کا اختتام چونکاتا ہے۔ہمارے جدید معاشرتی نظام پہ یہ افسانہ تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے۔گھروں میں نوکر یا نوکرانی پس پردہ کیا کچھ گُل کھلاتے ہیں یا گھر کا مالک اور مالکن اُن سے کیا کچھ کام لیتے ہیں، مذکورہ افسانہ اُس کا بین ثبوت ہے۔زیر نظر افسانے میں رمیش، مدھو، شیلا، گپتا جی اور آکاش جیسے کرداروں کی حرکات وسکنات سے افسانے کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔رمیش کی ماں مدھو اپنے آوارہ اور نافرمان بیٹے سے اس بات پہ نالاں ہے کہ بیٹا پڑھائی لکھائی پہ کوئی خاص توجہ نہ دینے کے بجائے اپنے یار دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت موبائل فون پہ گزارتا ہے، چیٹنگ کرتا ہے، نشہ کرتا ہے اور بے وقت گھر آتا ہے۔ایک روز پڑوس کے گپتا جی، مدھو کے گھر میں آکر بڑے کرخت لہجے میں اُس سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ کا بیٹا میری لڑکی کو چھیڑتا ہے۔اُسے سمجھایا جائے ورنہ وہ اسے پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔رمیش کا باپ آکاش اپنے بیٹے کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیتا ہے اور افسانے میں اُس کا کردار اختتام سے پہلے تک ایک خاموش اور بہت حد تک گمنام سا کردار معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کے اختتام پر یہی کردار قاری کے ذہن پر حیرت واستعجاب کا باعث بنتا ہے۔شیلا نوکرانی کو جب ایک دن رمیش کی ماں اُلٹی کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو سمجھ جاتی ہے کہ وہ کنواری ماں بننے جارہی ہے۔وہ اپنے بیٹے پر شک کرتی ہے کہ ضرور یہ میرے بیٹے کی حرکت ہوگی وہ غصے میں اپنے بیٹے کے گال پہ

چانٹا رسید کرتی ہے لیکن مدھو کی حیرت کی انتہا اُس وقت نہیں رہتی کہ جب وہ ایک کمرے میں اپنے شوہر آکاش کو شیلا کا گال سہلاتے ہوئے دیکھتی ہے۔اس شرمناک کیفیت کی عکاسی مصنفہ نے درج ذیل اقتباسات میں اس طرح کی ہے:''دن بیتتے گئے۔ایک دن مدھو نے شیلا کو الٹی کرتے دیکھا''شیلا! شیلا! کیا ہوا تجھے؟''مدھو نے شیلا کو غور سے دیکھا تو شیلا سہم گئی''کچھ نہیں ......کچھ نہیں ......''کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔مدھو بھی پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں گئی۔بار بار پوچھنے پر شیلا مالکن! مالکن! کہہ کر مدھو کے پیروں میں گر گئی''مجھے بتا پگلی کس کا بچّہ ہے؟''شیلا زور زور سے رونے لگی۔''میں جانتی ہوں آخر یہ کاستانی کس کی ہے۔ہمارا منہ تو کالا کر دیا اس لڑکے نے''کہتے ہوئے مدھو تیز تیز قدموں سے رمیش کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے ایک زوردار تمانچا رسید کر دیا۔''نالائق! آخر تُو میری کوکھ ہی میں کیوں نہیں مر گیا؟ تیری وجہ سے آج یہ دن دیکھنے کو تو نہیں ملتا''،''لیکن ماں! میں نے اب کیا کیا؟''''شرم نہیں آتی پوچھتے ہوئے تُو نے کیا کیا؟''

افسانہ''فریب''کے یہ اختتامی جملے ملاحظہ فرمائے:''میری جان! تم گھبراؤ نہیں۔میں نے کب انکار کیا ہے کہ یہ بچّہ میرا نہیں۔یہ بچّہ میرا ہے۔مدھو کو اس بات کا کبھی پتا نہیں چلے گا۔میں تُم سے ضرور شادی کروں گا''مدھو نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو شیلا آکاش کی بانہوں میں رو رہی تھی اور آکاش اُس کے چہرے کو سہلا رہا تھا''

ہمارے سماج میں جادو،ٹونا اور دیگر کئی لعنتیں اور خباثتیں مثلاً حسد،رشک،بغض،عناد ،کینہ اور رنجشیں بُرے لوگ اپنے دل و دماغ میں پالتے رہتے ہیں۔زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں پر جنِ،دیو،پری،چڑیل اور عفریت کا سایہ ہو جاتا ہے۔جن سے چھٹکارہ پانے کے لیے سحر زدہ لوگ پیروں،فقیروں اور بابا قسم کے لوگوں کے پاس جا کر اُن کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔افسانہ''آخر میں نے پالیا تجھے''ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ندیم پر کسی جنی کا سایہ ہو جاتا ہے اور بالآخر ایک پیر صاحب کی جھاڑ پھونک اور تعوز گنڈوں سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔پھر وہ آسیہ نام کی ایک لڑکی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔آسیہ کے ماں باپ اُس کے بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے ہیں اس لیے آسیہ کی پرورش اُس کے ماموں کرتے ہیں۔جو بڑے سخت مزاج کے ہوتے ہیں آسیہ کے ماموں نہیں چاہتے کہ ندیم کے ساتھ اُس کی شادی ہو لیکن پیار کرنے والے کبھی ڈرتے نہیں،جو ڈرتے ہیں وہ پیار کرتے نہیں۔بالآخر ندیم اور آسیہ ازدواجی رشتے کی ڈور میں بندھ جاتے ہیں۔اس افسانے کے پلاٹ میں معمولی سا جھول پیدا ہوا ہے۔ندیم کا بیمار ہو جانا مانتے ہیں ایک فطری بات ہے لیکن ٹھیک ہو جانے کے فوراً بعد آسیہ پر فریفتہ ہو جانا افسانے کے ابتدائی واقعے سے میل نہیں کھاتا۔

ارشد سیماب ملک

مکاتیب بنام ڈاکٹر غلام جیلانی برق

عنایت اللہ مشرقی بہ نام ڈاکٹر غلام جیلانی برق

از پشاور۔ ۴ ریزیڈنسی روڈ ۲۸۔اگست ۳۰ء

مکرم ومحترم السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ۔

میں یہاںپر موجود نہ تھا اسلئے آپ کا محبت سے بھرا خط ابہی ابہی [ابھی ابھی] ملا۔ میں اس امر کے لئے خدائے عزوجل کا کمال سپاسگزار [سپاس گزار] ہوں کہ تذکرہ کے ذریعے سے قرآن حکیم کی عظمت پہر [پھر] مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ رہی ہے۔ اور جس خلوص دل اور حقیقت نوازی سے آپنے [آپ نے] اسکا اظہار اپنے خط میں کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسکے لئے آپکو مبارکباد کہوں۔ میری ذات کے متعلق جو کچہہ [کچھ] آپ نے کہا ہے اس کا اہل نہیں ہوں اگرچہ خوش ہوں کہ آپنے تذکرہ کی تعلیم کو قابل قدر پایا اور اس کو مسلمانوں کی نجات دنیوی اور اخروی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اس پرآشوب زمانے میں کہ ہر طرف ھندوستان میں ھیجان برپا ہے اور دیگر مما لک بہی [بھی] اس سے متاثر ہورہے ہیں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے بہترین طرز عمل یہ ہے کہ اپنی بہبودی کے لئے یک قلم سرگرم عمل ہوجائیں اور قومیں عمل کا نمونہ خود اُن کے سامنے پیش کررہی ہیں اور اب کوئی گنجائش نہیں رہی کہ جمود اختیار کیا جائے۔ ایسے موقف میں کتابوں کی نسبت عمل زیادہ موزوں ہے کیا آپ کے نزدیک تذکرہ کی پہلی جلد کافی اور وافی نہیں یا کیا دوسری جلد کی اسلئے ضرورت ہے کہ پہلی پر عمل مکمل ہو چکا ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں نے ابہی اسکا پہلا صفحہ بھی نہیں پڑہا [پڑھا] اور پہلے صفحے کے پہلے حرف پر بہی عمل نہیں کیا اگر میں زندہ رہا تو بقیہ جلدون [جلدوں] کو مکمل کر کے چھوڑونگا لیکن اگر زندہ نہ رہا تو میرے جیسے اور بہت آجائینگے جو اسکو (___ لفظ نہیں پڑھا جا رہا) پورا کر کے رھینگے [رہیں گے]۔ اللہ عزوجل کے پاس کسی شے کی کمی نہیں۔ صرف وہی بے مثال ہے۔ میرا وجود ایسا ہے کہ میں خود اس سے شرمسار ہوں۔ یعنی عمل کا وقت ہے اور ابہی [ابھی] میں تیار نہیں ہوا۔

آپکی آیت اَلَّذِینَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ عِبَادٌ أَمْثَالُکُم کو جو آپنے ''الوسیلۃ'' کی تائید میں لکھی ہے دیکھکر [دیکھ کر] خود آپکے بیان کی کہ میرے جیسا پیدا ہونا مشکل ہے تکذیب ہوتی ہے۔

دیکھئے خود آپ ہی نے ایک اور آیت پیش کر دی۔ یہ آیت میں نے پیر پرستی کے خلاف تیسری جلد میں لکھی ہے

مخلص عنایت اللہ

●

حفیظ جالندھری بہ نام ڈاکٹر غلام جیلانی برق

سیٹلائٹ ٹاؤن، سید پور روڈ، راولپنڈی
2/3/63

محترم۔ مکرم اور پیارے برق صاحب۔ وعلیکم السلام
برق صاحب کا یعنی آپکا لکھا ہوا ایک خط مجھے ملا۔! اور مجھے مخاطب بھی فردوسیٔ [فردوسیِ] اسلام کے نام سے کس نے کیا ہے۔ برق نے۔ اس برق نے جس کی لپک طوفانی اندھیروں میں اپنی راہ ڈھونڈنے میں میری مدد کرتی رہی ہے۔ آپ سے (ایک مرکب لفظ نہیں پڑھا جا سکا) ملنے کی تمنا کا اظہار بھی کئی بار آپ کے بھائی صاحب سے کر چکا ہوں۔ لیکن مشاعرے میں یا جیسا کہ آپنے اسے محفل شعر فرمایا ہے آپ سے مجھے محض آپ سے'' بات کرنے کی، آپ کو اپنی بات مجھے سمجھانے کی فرصت کہاں ہوگی؟ تاہم آپ نے مخاطب کر لیا ہے شاعر کو۔ خالی خولی شاعر کو محفل شعر میں دعوت نہ دی جائے۔ تو آخر اور کیا تقریب اس کے لیے پیدا کی جائے۔ یہ تقریب پیدا کرنا نیا اسلوب ہے۔

میرے پیارے برق صاحب جس بستی میں آپ ہیں، وہی تو آباد ہے۔ مجھے تو آپ ایسے اہلِ نظر نے یہی دکھایا تھا کہ جہاں دل ہے وہاں سبھی کچھ ہے۔ جہاں دل نہیں وہاں محض آب و گل ہے۔! خیر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ یاد کریں اور میں اسے عزت افزائی نہ سمجھوں۔ غالباً اس بدلی ہوئی یا بدلتی ہوئی دنیا میں عزت کو توہین کی شکل بھی اختیار کرنے کا خطرہ آپ کو لاحق ہے۔

میری جان میں تو آپ سے ملنے اور پھر مل بیٹھنے کا ارماں رکھتا ہوں۔ آپ برقِ ہویدا ہیں میں برقِ پنہاں اور میرا خیال ہے کہ خوب گذر سکتی ہے۔ لیکن ــــــ ہائے۔ یہ لیکن بھی آدھمکی۔ تاہم لیکن کی مجبوری ہے۔ اور مجبوری یہ ہے کہ انہی تاریخوں میں میری ایک بیٹی کا نکاح کراچی میں ہے ــــــ اب فرمایئے۔

کاش آپ اپریل کے آغاز ہ ہفتوں میں بلاتے۔ یا بلا سکتے ــــــ یہاں لفظ ''فبہا'' قبول فرمایئے۔

اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری تجویز میری بھی سن لیجئے۔ کہ میں آپکی محفلِ شعر کی بجائے تن تنہا آ کر ایک پر بہار محفل جماؤں۔ لوگ مجھے ڈوم مراثی میرے ترنم سے پڑھنے کے باعث بطور عزت افزائی کہہ کر (دو لفظ نہیں پڑھے جا سکتے)۔ اس لئے آپ کے ہاں خوب کھاؤں۔ اور خوب ہی گاؤں۔ سات آٹھ شاعروں سے (شاید) زیادہ بہار لا سکتا ہوں۔ اگر چہ اب خزاں رسیدہ ہوں۔
باقی رہا گلڈ کا فنڈ۔ نا صاحب۔ برق کا واسطہ درمیان ہے۔ تو میں ساری عمر آتش ندامت میں جلنے کو تیار نہیں۔ اور یہ تو فرمایئے اگر میں خود بخود آپ سے ملنے کے لیے کیمبل پور آ جاتا۔ تو کیا آپ مجھے کرایہ پیش کرتے۔ نہیں صاحب یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ صحیح معنوں میں توہین کے مرتکب ہوں۔
آپ کا والہ و شیدا

حفیظ

جواَب جالندھر سے فارغ ہونے کے باوجود جالندھری ہے۔

●

اختر شیرانی بہ نام ڈاکٹر غلام جیلانی برق

برادر محترم،
تسلیم، مدت ہوئی آپ کا والا نامہ باصرہ نواز ہوا تھا۔ بیحد [بے حد] افسوس اور ندامت ہے کہ پیہم علالت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔
ایک نیا رسالہ نکال رہا ہوں۔ اس عریضے کا مقصد آپ کی توجہات کو اپس کی طرف منعطف کرانا ہے۔
فی الحال احباب کی سعی توسیعِ اشاعت کا اندازہ کرنے کی غرض سے ایک فہرست مرتب کی جا رہی ہے۔ جسمیں [جس میں] متوقع خریداروں کے اعداد درج کیئے جا رہے ہیں۔ از راہ کرم بواپسی مطلع فرمایئے کہ آپ کے نام کے ساتھ کتنے خریداروں کا وعدہ درج کیا جائے؟
میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جن چار یا پانچ دوستوں کی امداد کے بھروسے پر یہ جوا کھیلا جا رہا ہے اُن میں ایک آپ بھی ہیں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے!
جواب اور خیریت مزاج سے جلد مطلع فرمایئے۔

والسلام
مخلص
اختر شیرانی

سید نصرت بخاری

میرا دوست راشد علی زئی

شاعر، محقق، مبصر اور صحافی، راشد علی زئی کا اصل نام دوست محمد ہے۔ 3/ اکتوبر 1962ء میں حضرو میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ محمد خان اسد ہے۔ ان کی اپنی خودنوشت کے مطابق 1974ء میں گورنمنٹ پرائمری سکول پیر داد سے حاصل کی۔ 1977ء میں مڈل کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے پاس کیا۔ 1979ء میں گورنمنٹ ہائی سکول حضرو سے میٹرک کا مرحلہ عبور کیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج اٹک سے ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں پاس ہوئے۔ بعد ازآں بی۔ اے بھی کر لیا۔

صحافت سے بھی وابستہ تھے اور چھچھ کے فعال اور نمایاں صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ 1995ء میں مجلہ ''صدف'' کی ادارت کی۔ 1998ء میں ہفت روزہ اخبار ''حضرو'' کا اجرا کیا۔ اس کے مدیر بھی رہے۔ 2009ء میں ہفت روزہ اخبار ''فصیل'' جاری کیا۔

ان کے والدِ مرحوم کا ایک عمدہ کتاب خانہ تھا جس میں نایاب کتابیں تھیں؛ بعض کتب ایسی کم یاب یا نایاب ہیں جو شاید ہی برصغیر کے کسی کتب خانے میں موجود ہوں؛ راشد علی زئی نے ان کی وفات کے بعد اس علمی خزانے کو بکھرنے نہیں دیا۔ وہ نہ صرف اس کتب خانے کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافے کے لیے بھی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے؛ اور کتب خانے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند بھی رہتے تھے۔ کتب کے علاوہ مشاہیر کے نادر و نایاب خطوط کا ذخیرہ بھی ان کے کتب خانے میں موجود تھا؛ جو راشد علی زئی نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا تھا۔ ان کے کتب خانے میں یونی ورسٹیوں کے طلبہ و طالبات کے ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی سطح کے غیر مطبوعہ مقالات بھی کثیر تعداد میں موجود تھے؛ اس سارے ذخیرے کے پیچھے راشد علی زئی کا شوق اور محنت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کا کتب خانہ دور و نزدیک کے محققین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ راشد علی زئی ہر ایک کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے، کتابوں کے علاوہ قیام، طعام اور دیگر ماکولات کے ساتھ خدمت میں پیش پیش رہتے، تھکاوٹ اور بے زاری سے بے نیاز مسکراتا ہوا ان کا چہرہ دمکتا رہتا۔ علم و ادب کی خدمت کرتے ہوئے وہ یقیناً خوشی محسوس کرتے تھے۔ ملک کے نام ور محققین نے ان کے کتب خانے کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ کتاب کسی کو نہیں دیتے تھے کیونکہ اس معاملے میں ان کا تجربہ تلخ تھا؛ جو شخص کتاب لے کر جاتا اسے کتاب واپس کرنا بھول جاتا؛ اس لیے جب کوئی کتاب لے جانے کی ضد اور زبردستی کرتا تو اس کے گرد گھومنے لگتے لیکن کسی کے ہاتھ سے کتاب نہ چھینتے اور نہ راستہ روکتے البتہ طواف کا

سلسلہ جاری رہتا؛ ایسا مہذب شخص آج کل کہاں ہوگا۔ مہمان اہل قلم کے علاوہ مقامی ادیبوں اور صحافیوں کی جائے پناہ بھی ان کا کتب خانہ تھا۔ راشد صاحب ہر ایک کے دوست تھے، یہ ان کی ایک خوبی تھی کہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ وہ اُن کے زیادہ قریب ہے۔

2009ء میں چھچھ پریس کلبِ تحصیل حضرو کے پہلے چیئرمین منتخب کیے گئے۔ ''ادارہ فروغِ ادب حضرو'' اور'' کاروانِ ادب'' کے جنرل سیکرٹری رہے۔ جمعیۃ العلما اسلام ضلع اٹک کے جنرل سیکرٹری کا عہدہ بھی ان کے پاس رہا۔ راشد علی زئی "اسد اکیڈمی" کے نام سے اشاعتی ادارے کے بھی مالک تھے۔ راشد علی زئی کی علمی وادبی خدمات پر ایم۔فل کا مقالہ لکھا جاچکا ہے۔

دل کے دورے نے اس ہنستی مسکراتی بے ضرر شخصیت کو 21۔ مارچ 2020 کو ہم سے چھین لیا۔ عالمی وبا'' کرونا'' کی وجہ سے ہر آدمی اپنے گھر میں دبکا بیٹھا ہے؛ دوست، احباب اور اعزہ سے بھی کوئی نہیں ملتا؛ اس عالم میں جب راشد علی زئی کی وفات کی خبر ملی تو دماغ نے کہا کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ گھر میں بیٹھے رہو لیکن دل اس بات پہ راضی نہیں تھا کہ دوست کا سفر آخرت ہو اور اسے الوداع کہنے والوں میں میرا اشمار نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ کرونا وبا کی وجہ سے ان کے جنازے میں صرف محلہ، برادری کے لوگ ہوں گے لیکن وہاں تو جم غفر تھا؛ یہ راشد علی زئی کی محبت کا ثبوت تھا کہ دور دراز سے لوگ '' کرونا وائرس '' جیسی مہلک وبا کی پروا کیے بغیر ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ راشد علی زئی کو مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس بے لوث شخصیت کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مطبوعات : خواجہ محمد خان اسد: احوال آثار،، پٹھانوں کے شاہ ولی اللہ، شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام، اوراقِ انوار، توقیر علی زئی: حیات وخدمات، سفیرانِ چھچھ، شامل'' ہیں: تذکرہ شعرائے چھچھ، اٹک کے اہل قلم کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی اوران کا شعری مجموعہ بھی منظر عام پر عام والا تھا۔

رپورٹ: محمد اویس باسل۔ گجرات

کل پنجاب پنجابی کانفرنس اور مشاعرہ

مادری زبانوں کے عالمی دن کے موقع پر دل دریا پاکستان تنظیم کا کل پنجاب پنجابی کانفرنس کا انعقاد کانفرنس کا انعقاد ضلع کونسل ہال گجرات میں کیا گیا۔ صدارت مہان پنجابی سیوک ماہر تعلیم ماہر لسانیات مترجم محقق پروفیسر ڈاکٹر عامر ظہیر بھٹی (نمل یونیورسٹی اسلام آباد) نے فرمائی۔ پروگرام کا آغاز اللہ کریم کے نام سے ہوا۔ تنظیم کے بانی وصدر علی احمد گجراتی نے آنے والے شرکاء کو خوش آمدید کہا اور پروگرام کی نقابت کی۔ کانفرنس کے مقررین میں ادریس چیمہ اسلام آباد، سکندر بیگ جہلم، گوہر الرحمن گہر مردانوی مردان، کامریڈ ضیاء اللہ ڈھکوٹ، کامریڈ سعید احمد فیصل آباد، مرزا عزت بیگ گجرات، طارق مغل گوجرانوالہ، افتخار بھٹہ گجرات، افتخار وڑائچ کالروی گجرات، مرزا عبدالرشید انچارج ای لائبریری گجرات، علی احمد طاہر گجرات، شہزاد حسین بھٹی اسلام آباد، اقبال زرقاش اٹک، اور ظہیر بٹ منگوال کے نام شامل ہیں۔ مقررین نے اپنے خیالات کا ااظہار کرتے ہوئے پنجابی زبان کی تاریخ پنجابی زبان کی وسعت اور اور اثر پزیری پر خاص طور پر بات کی۔ مادری زبانوں کے تعلیمی نظام کا حصہ بنانے اور بنیادی تعلیم کے مادری زبانوں میں حصول کے معاشرے پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں بھی بات ہوئی۔ مقررین نے اپنی بات چیت میں پنجاب کے لوگوں پر زور دیا کہ وہ اپنی زبان کو اپنے لیے فخر اور عزت سمجھیں۔ اپنی زبان میں تخلیقی اور تحقیقی کام کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس کانفرنس میں یہ بھی بتایا گیا کہ مادری زبانوں میں تعلیم ہی اقوام کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ آج تک دنیا کی کسی بھی قوم نے ایک قوم کے طور پر غیر زبانیں پڑھ کر ترقی نہیں کی۔ غیر زبانوں کا رعب ماننا غلام ذہنوں کی نشانی ہے۔ عامر ظہیر بھٹی صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہمیں پنجابی زبان کی خدمت اور تحفظ کے لیے دن رات کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پنجابی زبان پنجاب کے لوگوں کی پہچان بھی ہے اور پنجاب کی شرح خواندگی بڑھانے کا واحد حل پنجابی زبان کو بنیادی ذریعہ تعلیم بنانے میں ہے۔ اس موقع پر پنجابی مشاعرے کا اہتمام بھی ضلع کونسل ہال گجرات میں کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت مہان پنجابی شاعر محمد حنیف ساقی حافظ آباد نے فرمائی۔ علی احمد گجراتی اور عمران سہیل نے پروگرام کی نقابت کی۔ مہمانانِ خصوصی میں اقبال قمر جہلم، ادریس چیمہ اسلام آباد، محمد شوکت ڈار گوجرانوالہ، اعظم علی اعظم چنیوٹ، سیف اللہ باجوہ حافظ آباد، اقبال رزقاش اٹک، بابائے مردان گوہر الرحمن گہر مردانوی مردان، تنویر طاہر کیانی جہلم، سکندر بیگ جہلم، شہزاد حسین بھٹی اسلام آباد، مقصود یاور گوجرانوالہ، آصف جاوید اور شاہ دل شمس نے حافظ آباد سے شمولیت کی۔

دیگر اعزازی شعرا کرام میں مظہر عباس، فخر بلال پنجابی، ڈاکٹر محمد جاوید جعفری، عمران سہیل، سیف اللہ ساجد، تنویر دانش، اسد عباس راز، لیاقت قندیل، طارق فیاضی، عصمت اللہ سیکھو، انعام اللہ، ناصر مان

، امتیاز احمد چٹھہ، فیاض الرحمن، قاسم علی منظر، محمد اویس باسل، ناصر حیات صحرائی، مدثر عباس راقم، گوہر علی گوہر، اظہر اقبال رانجھا، یاسر ادیب، علی روش، قیصر محمود گجر، رومی بیگ نے شمولیت کر کے محفل کے رونق میں اضافہ کیا۔ کانفرنس کے آخر پر مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا اور چائے اور دیگر لوازمات سے خدمت کی گئی۔

رپورٹ: ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

ماہانہ نعتیہ مشاعرہ

سرزمینِ حسن ابدال اور گردونواح میں نعتیہ ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ادارہ محفل نعت پاکستان حسن ابدال کے زیرِ اہتمام ادارہ دنیائے نعت کے اشتراک سے انتالیسواں (39) مسلسل ماہانہ نعتیہ مشاعرہ ملک گیر ادبی تنظیم چوپال پاکستان کے نعت فورم کے تعاون سے جناب ملک آصف اقبال اور جناب ملک جنید اقبال کی میزبانی میں ان کے والد جناب ملک قمر اقبال کے ایصالِ ثواب کے لیے ماہِ رجب کی مبارک ساعتوں میں بتاریخ 29 فروری 2020 بمطابق 04 رجب المرجب 1441 ھجری بروز ہفتہ بمقام ڈیرہ ملک گلوخان حسن ابدال انعقاد پذیر ہوا۔ دو دن سے مسلسل برستی بارش کے باوجود اٹک، کامرہ، واہ کینٹ، حسن ابدال، برہان سے معزز شرکائے کرام نے اپنی شرکت کو یقینی بنایا اور سامعین کی بھی ایک کثیر تعداد نے محفل میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ کیفیات سے بھرپور اس بابرکت اور بارونق محفل کی صدارت ضلع اٹک کے معروف بزرگ نعت گو شاعر جناب سعادت حسن آس نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی کی نشست پر اٹک ہی کے شاعر جناب سید نصرت بخاری رونق افروز ہوئے۔ محفل کی نظامت جوائنٹ سیکرٹری محفلِ نعت جناب حافظ عبدالغفار واجد نے کی۔ تلاوتِ کلام پاک کی سعادت جناب عارف قادری نے حاصل کی جبکہ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سعادت شاہد الرحمان صابری نے حاصل کی۔ اس موقع پر صدرِ محفل نے اپنے صدارتی خطبے میں تمام اراکینِ محفل کا شکریہ ادا کیا اور شرکائے محفل کے معیاری کلام کو سراہا۔ محفل کے اختتام پر ختم قل شریف پڑھا گیا اور جناب عارف قادری نے محفل کے توسط سے تمام مرحومین کے لیے بالعموم اور حال ہی میں 4۔ فروری کو وفات پانے والے میزبان محفل کے والد اور ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش کے چچا جناب ملک قمر اقبال کے لیے خصوصی دعائے مغفرت کی۔ اس موقع پر سیکرٹری محفلِ نعت کے والد ملک عبدالحمید اور بھائی ملک گلوخان اور ماہِ فروری میں ہی جواں مرگی کا شکار ہونے والے اسلام آباد کے معروف شاعر ڈاکٹر علی یاسر کے بشمول تمام حاضرینِ محفل کے تمام مرحومین کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کی گئی۔ تمام بیماروں کی صحت اور شرکائے مشاعرہ کی دلی حاجات کی منظوری اور ملک وملت کے استحکام کے لیے خصوصی دعا کے ساتھ محفل کا اختتام ہوا۔ بعد از محفل پر تکلف ظہرانے سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

مکتوبات

محترم بخاری صاحب!

ذوق 3 اٹک شمارہ اگست 2019 میں احسان بن مجید کا لکھا ہوا مضمون "نعت کے تقدس کا معاملہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں موصوف نے ان شعرا کو تنقید کا نشانہ بنایا جنہوں نے اپنی شاعری میں اپنے آپ کو سگ مدینہ یا سگ کوئے مدینہ ہونے کا اظہار کیا ہے۔ بقول موصوف انہوں نے انسانی عظمت کی نفی کی ہے اور یہ اشعار انسانیت کی بد ترین تذلیل کا مظہر ہیں۔ موصوف کی خدمت میں عرض گزار ہوں کہ جب ایک شے کو دوسری شے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو وہ تشبیہ من بعض الوجوہ ہوتی ہے نہ کہ من کل الوجوہ۔ جس طرح حضرت علی المرتضیٰؓ کا مشہور زمانہ لقب شیر خدا ہے اب شیر کا گوشت بھی کتے کے گوشت کی طرح حرام ہے، اس کا لعاب بھی کتے کی طرح ناپاک ہے، مگر یہاں تشبیہ صرف بہادری میں ہے۔ جیسے شیر نڈر و بہادر ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ بھی بہادر ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن کو ابو ہریرہؓ کی کنیت سے نوازہ جس کے معنی ہیں "بلی کے بچوں کے باپ"۔ اس میں تشبیہ ایک جہت سے ہے اور وہ محبت ہے کہ جیسے باپ ساری اولاد سے محبت کرتا ہے ایسے ہی آپ بلی کے بچوں سے محبت کرتے اور یہ نام ابو ہریرہ اتنا معروف ہوا کہ آپ کو حقیقی نام سے کوئی جانتا ہی نہیں۔ تو جس طرح حضرت علیؓ کو شیر خدا کہنے سے وہ شیر نہیں بنتے بلکہ شیر کا وصف بہادر ہونا مراد لیا جاتا ہے اس طرح سگِ مدینہ کہ کر اس کی وفاداری مراد لی جاتی ہے اور یہ لفظ بڑے بڑے جید علما نے اپنی شاعری میں استعمال کیا پچھلی صدی میں شریعت و طریقت کے عظیم امام جن کو تمام مکاتب فکر نے اپنا پیشوا تسلیم کیا ہے پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہوواں سگ میں مدینے دی گلی دا — ایہو رتبہ اے ہر کامل ولی دا

حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

پارۂ دل بھی نہ نکلا دل سے تحفے میں رضا — ان سگانِ کو اتنی جان پیاری واہ واہ

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

دل کے ٹکڑے نذرِ حاضر لائے ہیں — اے سگانِ کوچہء دلدار ہم

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا — تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

مندرجہ بالا شعر اس نعت کا ہے جو آپؐ کے دیدار کا سبب بنی۔

دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں:

امیدیں لاکھوں ہیں مگر بڑی امید ہے یہ — کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں — مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار

جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب مرے — کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار

اور شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

چہ کند سعدی مسکیں کہ صد جان — سازیم فدائے سگِ دربانِ محمد

(ترجمہ) ایک جان نہیں سو جانیں بھی ہوں تو حضور ﷺ کی بارگاہ کے دربان کے کتوں پہ قربان کردوں۔

حضرت بیدم وارثی فرماتے ہیں:

سگِ طیبہ مجھے سب کہ کر پکاریں بیدم — یہی رکھیں میری پہچان مدینے والے

اور مولانا جامی فرماتے ہیں:

من کیستم دمے دوستی می زنم　　　　کمین سگان کوئے تو یک کمترین منم

ترجمہ: میں بھلا کون ہوتا ہوں کہ آپ سے دوستی کی بات کروں میں تو آپکی گلی کا ایک ادنیٰ کتا ہوں۔

سگ کوئے مدینہ کی تو بڑی عظمت مولانا جلال الدین رومی جیسا عظیم صوفی اور عالم تو اپنے مرشد کی گلی کے کتے کو شیروں پر فضیلت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

آں سگے کوگشت درکویش مقیم　　　　خاک پایش بر ز شیرانِ عظیم

ترجمہ: جو کتا میرے محبوب کی گلی میں رہتا ہے اسکے پیر کی خاک بڑے بڑے شیروں سے بہتر ہے۔

حضرت علامہ غنیمت کنجاہی جیسا مجذوب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں فرماتے ہیں:

چو خودرا من سگ کوئے تو خواندم　　　　بہ آہوئے حرم نسبت رساندم

ترجمہ: اے میرے غوث جب میں نے خود کو آپ کی گلی کا سگ کہا تو گویا میں نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی طرف نسبت کر دی۔ اور پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں ایک زخمی کتے کو دیکھا تو اسکی پٹی کی۔ تو جناب کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس طرح کے لاتعداد واقعات ہیں جن میں شعرا اور بزرگوں نے اپنے آپ کو سگِ مدینہ کہ کر وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور سگان مدینہ کی عزت و توقیر کر کے اپنے لیے بخشش کا سامان کیا ہے۔ اور مندرجہ بالا تمام ہستیوں کو ایک زمانہ جانتا اور پہنچانتا ہے اور ان کی علمی قابلیت کا معترف ہے۔ یہ سب حضرات انسانیت اور انسانیت کی تذلیل و توقیر کو آپ سے بہت بہتر انداز میں جانتے تھے۔ اگر بات دنیا کے محبوب کی ہوتی تو آپ کی بات ٹھیک تھی لیکن یہاں سگ کی نسبت اس محبوب ہستی کے ساتھ ہے کہ جن کی وجہ سے یہ ہستی معرضِ وجود میں آئی جن کے شہر کی مٹی کو بطور شفا استعمال کیا جاتا ہے۔ جن کے شہر کے درود یوار اور پتھروں سے محبت اور ان کے بوسے لینے کو عبادت سمجھا جاتا ہے جہاں عقل یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ جب وہ محبوب ہستی اپنا لعاب پھینکے تو وہ بھی زمین پہ نہیں جاتا بلکہ صحابہؓ اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیں وہ حجامت بنوائیں تو ان کے موئے مبارک کے لیے صحابہ ایک دوسرے پر سبقت لینے میں کوشش کریں، جن کی بارگاہ میں صبح و شام فرشتے سلام پیش کریں، جن کی خدمت میں ابوبکر و عمر جیسی ہستیاں اونچی آواز میں بات کرنا بے ادبی جانے۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

لہٰذا وہ اپنے آپ کو سگ مدینہ کہ کر انسانیت کی تذلیل نہیں بلکہ انسانیت کی معراج کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

مصادر:

(1) مراۃ العرفان (گولڑہ شریف 2000ء)
(2) حدائق بخشش (بریلی شریف 1903ء)
(3) قصائد قاسمی (انبالہ 1901ء)
(4) شرح حدائق بخشش شارح مفتی غلام حسن قادری (لاہور 2006ء)
(5) کلیات بیدم وارثی (لاہور 2012ء)
(6) درس مثنوی مولانا روم (مولانا شاہ حکیم محمد اختر 2001ء)
(7) نام و نسب گولڑہ شریف (1998ء)
(8) زیارت نبی بحالت بیداری (عبدالمجید صدیقی ایڈووکیٹ لاہور 2003ء)

والسلام: محمد سعید قادری۔ اٹک

●●●

مکرمی نصرت بخاری، السلام علیکم۔

اداریہ ''خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے'' میں ادارت کی مشکلات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ باخدا کنارے

سے اندازہ نہیں ہوتا ،ادبا شعرا کو خواہ مخواہ کی بدگمانی ،شکوک وشبہات ،غیبت سے گریز کرنا چاہیے۔میں تو ادبی جرائد نکالنے والوں کے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ویسے اس میں کوئی فائدہ ہوتا بھی ہے یا دریا سے محبت ہے کہ نیکی کر کر اس میں ڈالتے رہتے ہیں۔

ذوق کا ورق ورق مطالعہ کیا۔خرم محبوب آثم کی نظم ''الحمد'' حساسیت سے معمور ہے۔افسانے پڑھے، پڑھ کر کچھ لکھنا چاہا،بس لکھا نہیں گیا۔خالد اقبال یاسر کا سیر حاصل انٹرویو تھا۔قیصر نذیر خاور نے ''کیا سکرپٹ رائیٹنگ/سکرین پلے ادب کی ایک صنف ہے'' نئے موضوع پر تحقیق کی۔بہت سے ناول اور افسانوں پر ڈرامے کے سکرپٹ لکھے اور چلائے گئے؛تو یہ ادب کی صنف تو ہے۔''عہدِ اکبر میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب'' الطاف حسین از جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نیو دلی اور ''میلہ بیساکھی گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ابدال'' نور محمد نظامی جیسے مضامین ذوق رسالہ کا ہر مذہب وملت کو یکساں جگہ دینے کی قابل ستائش کاوش ہے۔''پھر جادوگر غائب ہو گیا'' خوب صورت شاعر منیر نیازی کی خوب صورت شاعری پر خوب صورت مضمون ہے جو فرزانہ نیناں نے لکھا۔

ذوق زینہ زینہ ترقی کا سفر طے کر رہا ہے۔ والسلام

[دُردانہ نوشین] خان

جدید لکھنے والوں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی جا رہی ہے جن کے ہاں مقصدیت کا فقدان عام دکھائی دیتا ہے لیکن اس ہجوم میں بعض لکھنے والے اب بھی مقصدیت کا علم اُٹھائے سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔دُردانہ نوشین کا شمار ایسے ہی ادیبوں میں ہوتا ہے۔حال ہی میں ان کا

ناول صُفہ

ایس وقت پر منظر عام پر آیا ہے؛ جب ناول کو قحط سالی کا خطرہ درپیش ہے۔اس ناول میں زندگی کے متعلق بہت کچھ ہے۔اسے آپ کے مطالعے کی میز پر ہونا چاہیے۔

(سید نصرت بخاری)